اسلام اور مذاہب عالم

علوم اسلامیہ پروگرام

ISLAMIC STUDIES PROGRAM

ماڈیول WR01: مذاہب عالم کا بنیادی تعارف

حافظ محمد شارق

www.islamic-studies.info

فہرست

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ ہم مسلم ہیں اور بحیثیت مسلمان ہم سب کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسلام کی دعوت ہم دنیا کے ہر ایک گوشے تک پھیلائیں۔ دعوت دین کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جس شخص کے سامنے ہم اسلام کی دعوت پہنچا رہے ہیں، ہم اس کے مذہب، نظریات اور خیالات سے اچھی طرح واقف ہوں تاکہ اس کی نفسیات، عقائد اور مذہب کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سے بات کی جا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن مجید میں یہ بات سکھائی ہے کہ دین کی دعوت پیش کرتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ پہلے مشترک امور پر بات ہو اور پھر اسی کو بنیاد بنا کر ان باتوں کی دعوت دی جائے، جہاں اسلام دیگر مذاہب سے مختلف مقام پر کھڑا ہے۔ دین کے جو پرجوش داعی، اس بات کا خیال نہیں رکھتے، وہ اپنی زبان سے ایسی منفی بات نکال بیٹھتے ہیں جس سے مخاطب کے اسلام سے متاثر ہونے کا امکان ختم ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں سے شدید نفرت جنم لیتی ہے۔

اسلامک اسٹڈیز پروگرام چونکہ دین کے طالب علموں اور دعوت دین کا شوق رکھنے والے احباب کے لیے ترتیب دیا گیا ہے، اس وجہ سے اس میں ہم نے دنیا کے مشہور مذاہب سے متعلق ایک سیریز شامل کی ہے جس کا عنوان ہے "مذاہب عالم پروگرام۔" یہ تقابل ادیان کے عام کورسز سے کچھ مختلف ہے۔ تقابل ادیان کے جو کورسز مختلف دینی مدارس اور جدید یونیورسٹیوں میں پڑھائے جا رہے ہیں، انہیں بالعموم متعصبانہ انداز میں لکھا جاتا ہے اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مصنف کے مذہب کی برتری کو بھونڈے سے انداز میں بیان کیا جائے۔ دیگر مذاہب کی منفی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جاتا ہے اور مثبت چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مذہب کے مثبت پہلوؤں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس سے قوم پرستی کے جذبے کی تسکین ہو تو ہو جاتی ہے، مگر دعوت دین کے لیے یہ اسلوب نہایت ہی غیر موزوں ہے۔ اس سے نہ تو دیگر مذاہب کا صحیح فہم حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسلام کی دعوت کے لیے کوئی مناسب حکمت عملی تیار کی جا سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دیگر مذاہب کا نہایت ہی بے تعصبی سے غیر جانبدارانہ بلکہ ہمدردانہ مطالعہ کریں تاکہ ان کا صحیح فہم حاصل کرنے کے بعد ان کے سامنے اسلام کا مثبت تعارف پیش کر سکیں۔ یہ پروگرام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس کے مصنف حافظ محمد شارق صاحب، جو ہماری ٹیم کے انتہائی محنتی رکن ہیں، خصوصی شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں۔

تقابل ادیان پروگرام کا اسٹرکچر

دین کے ایسے طالب علم جو علم، ذہانت اور علاقے کے اعتبار سے مختلف سطح پر ہوں، ان کی ضروریات مختلف ہوتی ہے۔ طالب علموں میں اس فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پروگرام کو مندرجہ ذیل ماڈیولز میں تقسیم کیا گیا ہے:

- ماڈیول WR01: اس ماڈیول میں ہم دنیا کے بڑے مذاہب جیسے ہندومت، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور الحاد کا تعارف اور ان کی تاریخ کا اجمالی مطالعہ کریں گے۔
- ماڈیول WR02: اس ماڈیول میں ہم ہندومت کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔
- ماڈیول WR03: یہ ماڈیول الحاد کے مفصل مطالعے پر مشتمل ہو گا۔
- ماڈیول WR04: اس ماڈیول میں ہم یہودیت کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔
- ماڈیول WR05: اس ماڈیول میں ہم عیسائیت کا مفصل مطالعہ کریں گے۔
- ماڈیول WR06: یہ ماڈیول بدھ مذہب کے مطالعہ کے لیے وقف ہو گا۔
- ماڈیول WR07: یہ ماڈیول دنیا کے اہم مذاہب کے علاوہ دیگر مذاہب مثلاً کنفیوشسزم، تاؤازم، پارسی اور دیگر پر مشتمل ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ماڈیول میں مختلف مذہبی تحریکوں کا بھی مطالعہ بھی کریں گے۔

مذاہب عالم پروگرام کے مقاصد

اس پروگرام کے مقاصد یہ ہیں:

- دنیا کے بڑے مذاہب سے واقفیت حاصل کرنا
- ان علوم سے واقفیت حاصل کرنا جو دنیا کی دیگر اقوام میں پائے جاتے ہیں
- دین اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان مشترک پہلو تلاش کرنا تاکہ ان کی مدد سے اسلام کی دعوت کی حکمت عملی تیار کی جائے

ایڈمیشن کی شرائط اور کورس کا طریقہ کار

اس کورس کا مقصد آپ کو ذاتی سطح پر (Personalized) تعلیمی خدمت فراہم کرنا ہے۔ ایڈمیشن کا طریقہ کار بالکل سادہ ہے۔ اس لنک

http://www.islamic-studies.info/?page_id=1209 پر جا کر رجسٹریشن فارم پر کیجیے:

آپ کو کورس بکس اور متعلقہ استاذ کا ای میل ایڈریس فراہم کر دیا جائے گا۔ روزانہ بنیادوں پر آپ کو ایک باب کا از خود مطالعہ کرنا ہو گا اور اس ضمن میں جو سوالات پیدا ہوں، انہیں بذریعہ ای میل اپنے استاذ کے سامنے پیش کرنا ہو گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آپ بذریعہ Skype یا Gmail آن لائن رابطہ کر کے بھی اپنے سوالات ڈسکس کر سکیں گے۔ آپ کا استاذ سے ون ٹو ون تعلق اس کورس میں نہایت ہی اہمیت کا حامل ہو گا۔

ہر ہفتے، آپ کو ایک پراگریس رپورٹ بھیجنا ہو گی جس میں اس ہفتے میں کیے گئے مطالعے کی تفاصیل فراہم کرنا ہوں گی۔ جیسے ہی آپ ایک ماڈیول ختم کریں گے، ایک مختصر سا امتحان لیا جائے گا جس کے بعد آپ اگلے ماڈیول کا آغاز کریں گے۔

ہم اپنے کسی پروگرام کی کوئی فیس وصول نہیں کرتے مگر اس پروگرام میں شرکت کی فیس یہ ہے کہ آپ جو رقم ہر ماہ آسانی سے نکال سکیں، وہ آپ اپنے قریب کسی ایسے ضرورت مند شخص کو ادا کریں گے، جو کہ پیشہ ور بھکاری نہ ہو بلکہ محنت و مشقت کرتا ہو مگر اس کے اخراجات پورے نہ ہو پاتے ہوں۔ اس اہتمام کا مقصد طالب علموں میں انفاق فی سبیل اللہ کی عادت پیدا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کا صحیح فہم عطا فرمائیں اور اس کی دعوت کو پوری دنیا میں پھیلانے کی توفیق عطا فرمائیں۔

محمد مبشر نذیر

جمادی الاول 1434 / مارچ 2013

باب 1:یہودیت

تاریخی لحاظ سے یہودیت دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ایک ہے جس کی نسبت پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃالسلام کی طرف کی جاتی ہے۔یہ ایک توحیدی اور ابراہیمی مذاہب میں سے ایک اہم مذہب ہے جس کے پیروکار بنی ااسرائیل کہلاتے ہیں۔2006 تک ان کی تعداد 14 ملین تھی،اس وقت یہودی اکثریت والا ملک اسرائیل ہے ۔اسرائیل میں انہیں باقاعدہ حکومت حاصل ہے۔

اس مذہب کی تعریف (Definition) یوں کی جاسکتی ہے کہ یہودیت وہ مذہب ہے جس میں خدا کی وحدانیت اور بنی اسرائیل کی برتری و عظمت کا یقین رکھنا ضروری ہے۔یہی دو بنیادیں ہیں جس پر یہودی مذہب قائم ہے۔یہ مذہب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس کی مسلسل اور مرتب تاریخ محفوظ ہے۔اس مذہب کو عالمگیر مذہب کہنا مشکل ہے کیونکہ دنیا کے ہر ایک گوشے میں ہونے کے باوجود اس مذہب میں غیر اسرائیلوں کے داخلے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی ہے اور انہیں بہت مشکل مراحل سے گزار کر ہی یہودیت کے دائرے میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہودیوں کو بنی اسرائیل بھی کہا جاتا ہے۔اسلامی مقدس کتاب قرآن مجید میں بھی ان کے لیے یہی لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے۔اصل میں بنی اسرائیل کے معنی ہیں اسرائیل کی اولاداور اسرائیل حضرت یعقوب علیہ الصلوۃالسلام کا لقب ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ

یہودیوں کی تاریخ بہت طویل اور دل چسپ ہے۔مصر کی طرف سے ہجرت سے لے کر یورپ میں ہونے والی مبینہ ہولوکاسٹ تک ان کی تاریخ ہزار انتشارو مظالم سے بھری ہوئی ہے۔لیکن اس انتشار و مظالم کے باوجود اس قوم نے اپنی خاندانی وحدت ، صلبی نسبت اور نسلی نظریات کو حیرت انگیز طور پر محفوظ رکھا ہے۔عروج و زوال کا تسلسل اس طرح شاید ہی کسی قوم پر جس طرح یہود کی تاریخ میں آیا ہے۔ان کی تاریخ کا آغاز ہم حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃالسلام سے کرسکتے ہیں۔کچھ مورخین ان کا زمانہ 2067 قبل مسیح (BC)سے2024BC تک بتاتے ہیں اور کچھ 1955BC۔البتہ ان کے دور کے بارے میں کوئی ٹھوس تاریخی شواہد ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام(Abraham)

یہودیوں کی مقدس کتاب عہد نامہ عتیق کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام عراق کے قدیم شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ قدیم عراق کی تہذیب کو ''سمیری تہذیب'' کہا جاتا ہے اور اس علاقے میں جو قوم آباد تھی، اسے ''کلدانی'' کہا جاتا ہے۔ یہ شہر ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی صرف اس لیے انسانی ذہنوں میں ہے کہ تورات میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام کو اسی شہر کا باشندہ ظاہر کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم جوان ہوئے تو اللہ تعالٰی نے آپ کو نبوت عطا فرمائی اور آپ نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کر دی۔ آپ نے اس وقت کے بادشاہ نمرود کے سامنے بت پرستی کی مخالفت کی اور ایک بار رات کی تاریکی میں عبادت گاہوں میں جا کر سارے بت توڑ دیے۔ اس فعل کی پاداش میں نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام کو دہکتی آگ میں ڈالا جو حکم خداوندی سے گلزار بن گئی اور آپ کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ اس واقعے کے بعد حضرت ابراہیم نے فلسطین کی جانب ہجرت کی۔

ہجرت کے بعد آپ نے دین کی اشاعت کے لیے دو مقامات منتخب کیے۔ ایک فلسطین اور دوسرا مکہ۔ آپ کی دو بیویاں تھیں۔ ہاجرہ اور سارہ۔ ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے اور سارا سے حضرت اسحاق علیہما الصلوۃ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل کو آپ نے مکہ میں آباد کیا۔ وہاں قدیم اہل عرب عاربہ موجود تھے۔ جبکہ حضرت اسحاق کو فلسطین میں رکھا۔ حضرت ابراہیم نے حکم خداوندی کے تحت اسماعیل علیہما الصلوۃ السلام کی مدد سے کعبے کو از سرنو تعمیر بھی کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام کو بذریعہ خواب یہ حکم ملا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کریں۔ یہ حکم ملتے ہی اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہوگئے۔ مگر خدا نے ان کے بیٹے کے بجائے دنبہ ذبح کروادیا۔ مسلمانوں کے ہاں عیدالاضحیٰ کا مذہبی تہوار اسی واقعے کی یادگار ہے۔ عہد نامہ قدیم کے مطابق یہ بیٹے حضرت اسحاق تھے[1] جبکہ مسلمانوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ حضرت اسماعیل علیہما الصلوۃ السلام تھے کیونکہ حضرت اسحاق اکلوتے بیٹے نہ تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ الصلوۃ السلام کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی تھی ، جن کی اولاد عرب میں پھیلی اور سارہ عرب انہی کی اولادوں سے آباد ہوا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب بھی حضرت اسماعیل سے ہی ملتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ الصلوۃ السلام کے دو بیٹے ہوئے جن میں بڑے کا نام

[1] بائبل۔ کتاب پیدائش۔ باب 22۔ آیت 5

عیسو اور چھوٹے بیٹے کا نام یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام تھا، اور انہی کو اسرائیل کہا جاتا ہے۔'اسرائیل دو لفظوں سے مرکب ہے ، "اسرا" اور "ایل"۔ اسرا کے معنی بندہ اور ایل سے مراد اللہ ہے۔ اس طرح اسرائیل کا مطلب ہے عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ۔ حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام کے بارہ بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک مشہور پیغمبر حضرت یوسف علیہ الصلوۃ السلام بھی تھے۔ ان بارہ بیٹوں کی اولاد کو ہی بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام تک جتنے بھی پیغمبر آئے وہ سارے کے سارے حضرت یعقوب کی اولاد سے تھے ، اسی وجہ سے اہل یہود میں بعد ازاں نسلی امتیاز کا تصور قائم ہوا۔

حضرت یوسف علیہ الصلوۃ السلام (Joseph)

حضرت یوسف اور حضرت یعقوب علیہاالصلوۃ السلام کے دو اور بیٹوں کو تاریخِ یہود میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں ایک لاوی تھے جن کی نسل سے یہودیوں کا مذہبی طبقہ وجود میں آیا اور دوسرے یہودا تھے جن کی اولاد نے فلسطین آباد کیا ، انہی کی طرف انتساب سے فلسطین کے ایک حصے کا نام یہودیہ پڑا اور یہاں کے رہنے والے بنی اسرائیل یہود کہلائے۔ البتہ بعد میں یہ لفظ مذہبی اصطلاح بن گیا جس سے مراد وہ لوگ لیے جانے لگے جنھوں نے حضرت عیسیٰ کے سوا حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ السلام کی پیروی کا دعویٰ کیا۔

حضرت یوسف مصر میں وزیر اعظم کے عہدے پر متمکن ہوئے تو انہوں نے حضرت یعقو ب علیہ الصلوۃ السلام اور اپنے گیارہ بھائیوں بلوا کر مصر میں آباد کر دیا۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ مورخین اس بات کو مانتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ السلام کے دور میں تمام کے تمام بنی اسرائیل مصر نہیں گئے تھے بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ فلسطین میں رہا۔ انہی لوگوں نے دین ابراہیمی کے شعائر کو ایک زمانے تک قائم رکھا۔

مصر کی غلامی

مصر میں بنی اسرائیل کو بہت عروج حاصل ہوا۔ مورخین کے مطابق مصر میں ان کی آبادی اس قدر پھیل گئی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے ساتھ نکلنے والے بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً چھ لاکھ تھی۔ اس تعداد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں بنی اسرائیل کے علاوہ دیگر قوموں کے لوگ بھی ہوں گے جنہوں نے دین ابراہیمی کو قبول کر لیا ہو گا۔ اس زمانے میں اسرائیلوں میں نسل پرستی کے جذبات پیدا نہیں ہوئے ہوں گے کیونکہ انہیں انبیا کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی براہ راست راہنمائی حاصل تھی۔

حضرت یوسف علیہ الصلوۃ السلام کے انتقال کے کافی عرصے بعد بنی اسرائیل کا عروج ختم ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت

یوسف کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کرنے والا بادشاہ، عرب نسل کا تھا اور یہ خاندان "ہکسوس بادشاہ" کہلاتے تھے۔ مقامی مصریوں میں ان کے خلاف قوم پرستی کی ایک تحریک پیدا ہوئی اور انہوں نے ہکسوس بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ بنی اسرائیل چونکہ ان کے ساتھی تھے، اس لیے وہ بھی زیر عتاب آئے۔ اب مصر کے نئے حکمرانوں، جو کہ فرعون (جمع فراعنہ) کہلاتے تھے، نے انہیں اپنا غلام بنا کر مشقت میں ڈال دیا۔ یہ بنی اسرئیل خاصی طویل مدت کی حکمرانی کے بعد مصریوں کی غلامی میں جکڑے گئے۔ یہاں سے ان کی آزادی کا ذریعہ جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام بنے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام (Moses)

حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ السلام تک پہنچتا ہے۔ یہودی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ کی ولادت سے قبل اس وقت کے فرعونِ مصر، جس کا نام رعمیس ثانی بتایا جاتا ہے، کو اس کے نجومیوں نے اطلاع دی تھی کہ بنی اسرئیل میں ایک بچے پیدا ہونے والا ہے جو تمہاری باشاہت ختم کرکے قتل کر دے گا۔ یہ خبر پاتے ہی فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی ولادت ہوئی۔ ان کے والدین پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ ایک صندوق میں بچے کو رکھ کر دریا میں بہادیا جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کی والدہ نے ایسا ہی کیا اور ان کی بہن کو صندوق کے ساتھ ہی دریا کنارے چلنے کو کہا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صندوق کہاں گیا ہے۔ یہ صندوق تیرتا ہوا فرعون ہی کے شاہی محل کے کنارے آ لگا۔ فرعون کے لوگوں نے اس صندوق میں سے بچہ نکال کر فرعون کے پاس لے گئے۔ فرعون نے اسے قتل کرنا چاہا لیکن فرعون کی بیوی آسیہ نے کہا کہ یہ بچہ میرے اور آپ کے لیے آنکھ کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کیجیے۔ چنانچہ فرعون نے انہیں قتل نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے اسی محل میں پرورش پائی لیکن محل کے ظالمانہ اثرات ان پر ہرگز نہ ہوئے۔ وہ بنی اسرائیل پر ہونے والے مظالم دیکھ رہے تھے۔ یہودی روایات کے مطابق جوانی میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے ایک مصری کو دیکھا جو ایک اسرائیلی کو مار پیٹ رہا تھا۔ آپ اسے بچانے لگے لیکن ہاتھ کہیں غلط جگہ لگا اور وہ مصری مر گیا۔ بعد ازاں حضرت موسیٰ دوسری بار ایک مصری سے اسرائیلی کو سے بچانے کی خاطر آگے بڑھے تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ کل تم نے ایک مصری کو قتل کیا آج پھر کرنا چاہتے ہو۔ یہ خبر حکام کو جا پہنچی انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو گرفتار کرنے کا سوچا مگر آپ وہاں سے نکل گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام مصر سے مدین کی طرف روانہ ہوئے جہاں آپ کی ملاقات حضرت شعیب علیہ الصلوۃ والسلام

سے ہوئی اور انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی حضرت موسیٰ سے کر دی۔چند سال بعد حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے اپنے خاندان کے ہمراہ دوبارہ مصر جانے کا ارادہ کیا۔راستے میں انہیں وادئ مقدس طور پر وحی نازل ہوئی۔انہیں عصاء و ید بیضا (چمکتے ہاتھ) کا معجزہ بھی عطا کیا گیا اور حکم ملا کہ وہ ان نشانیوں کے ساتھ فرعون کے پاس جاکر اسے دینِ حق کی دعوت دیں اور بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نکالیں۔حضرت موسیٰ نے اس مشن کی تکمیل کے لیے اپنے بھائی ہارون علیہما الصلوۃ السلام کو بھی اپنا مددگار بنانے کی دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول کی۔

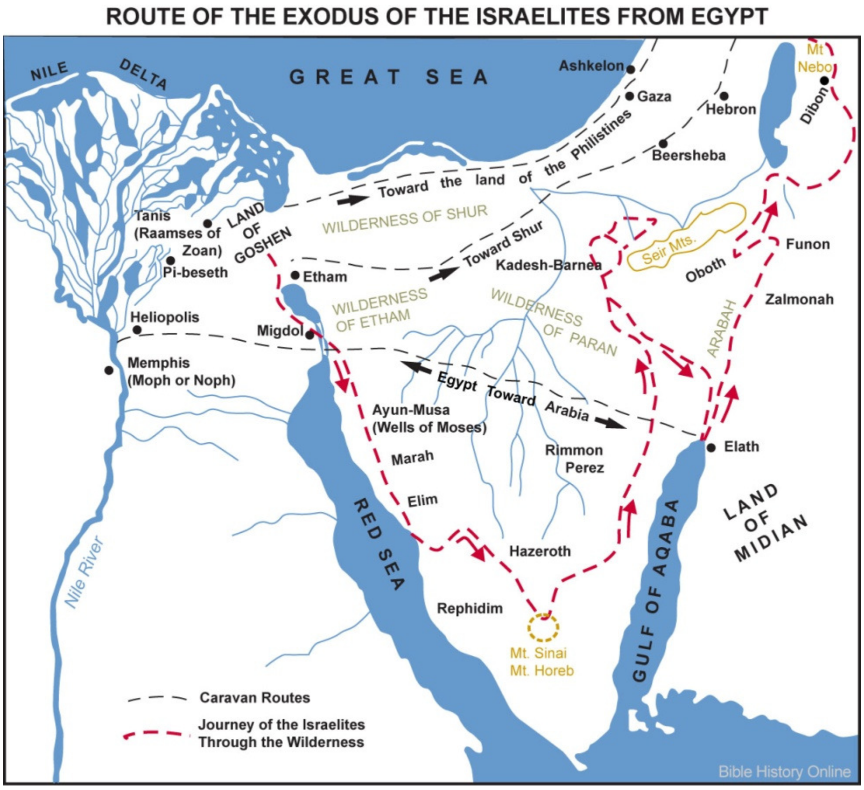
حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام، فرعون کے پاس گئے۔اسے دین کی دعوت دی اور بنی اسرائیل پر اپنا تسلط ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔فرعون اور حضرت موسیٰ کے مابین ہونے والا یہ مکالمہ ہمیں قرآن مجید میں بھی ملتا ہے۔اس دوران حضرت موسیٰ نے معجزات بھی دکھائے ، فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دربار کے کچھ لوگ ان پر ایمان لے آئے لیکن فرعون ایمان نہ لایا۔حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی دعوت کا فرعون اور اس کی قوم پر کوئی اثر نہ ہوا اللہ تعالیٰ نے ان پر کئی عذاب نازل کیے جن میں قحط، پھلوں کی کمی، طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک وغیرہ شامل ہیں۔لیکن فرعون اپنی گمراہی سے نہ لوٹا اور بنی اسرائیل پر ظلم و ستم مزید بڑھا دیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کے ہمراہ مصر سے ہجرت کرنے کا حکم دیا۔یہ واقعہ 1300BC کے لگ بھگ کا ہے۔

مصر سے ہجرت

حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام رات کی تاریکی میں بحیرہ احمر (Red Sea) کا راستہ اختیار کیا اور بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے روانہ ہوگئے۔یہ قافلہ جب سمندر کے پاس پہنچا تو اللہ تعالی نے بطور معجزہ ان کے لیے پانی میں سے ایک خشک راستہ بنا دیا۔یہ لوگ اس خشک راستے پر چل دیے۔فرعون بھی ان کا تعاقب کر رہا تھا ، وہ بھی اسی راستے آگے بڑھا۔جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پہنچ گیا تو دونوں طرف سے پانی دوبارہ مل گیا اور فرعون اور اس کا لشکر پانی میں گرعرق ہو گیا۔

یہود چونکہ عبرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا ان کے اکثر عقائد عبرانی ہی تھے، تاہم مصر میں طویل قیام کی وجہ سے ان پر بعض مصری رسوم و رواج کا بھی اثر ہوا تھا۔یہ لوگ عرصہ دراز سے اہل مصر کی بت پرستی دیکھتے آرہے تھے، اس لیے ان کے دل انہی رسوم کی طرف مائل تھے۔جب حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے جب انہیں ساتھ لے کر بحیرہ احمر کے دوسری جانب جزیرہ نما سینا کی طرف روانہ ہوئے انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بت کی پرستش کرتی تھی۔بنی

اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے ان کی طرح کا بت بنانے کی فرمائش کی جس پر حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے انہیں سخت سرزنش کی۔



http://miracle-ag-church-adyar.blogspot.com/p/truth-history.html (28 Feb 2013)

بنی اسرائیل نے بحیرہ احمر پار کر کے سینا میں قدم رکھا۔ یہ علاقہ وسیع صحرا پر مشتمل ہے جہاں سخت گرمی پڑتی ہے اور دور دور تک پانی اور سبزے کا کوئی نشان نہیں ہے۔ بنی اسرائیل اس منظر سے گھبرا کر حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے فریاد کرنے لگے۔ حضرت موسی نے دعا کی تو حکم ملا کہ اپنا عصا زمین پر ماریے۔ ایسا کرنے پر بارہ چشمے زمین سے پھوٹ پڑے تاکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے اپنے اپنے چشموں سے پانی پی سکیں۔ پانی کے بعد اس بیابان میں خوراک کا مسئلہ تھا چنانچہ اس کے لیے من و سلویٰ اتارا جاتا تھا۔ من و سلویٰ گندم نما گیہوں اور پرندے کے گوشت پر مشتمل تھا۔ البتہ اس کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ اسے ذخیرہ نہ کیا جائے۔ نیز ان کے لیے بادلوں کا سائباں بھی مقرر کیا گیا جو ہمیشہ انہیں گرمی کی شدت سے بچائے رکھتا۔ لیکن بنی اسرائیل نے ان نعمتوں کا شکر منانے کے بجائے موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے یہ شکایت کریں کہ ہم روز ایک ہی غذا کھا کھا کر اکتا گئے ہیں چنانچہ خداوند سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے زمین سے اعلیٰ

اور عمدہ اشیاء اگائیں۔[1]

احکام عشرہ (Ten Commandments)

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو کوہِ طور پر شریعت دینے کے لیے طلب کیا۔ آپ اپنی قوم سے تیس دن کی مدت مقرر کرکے کوہِ طور پر چلے گئے۔ یہیں آپ کو خدا تعالیٰ نے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ یہیں آپ پر تورات نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں بنی اسرائیل کے لیے دس بنیادی احکام دیے۔ یہ احکام بنی اسرائیل کے عقیدے کے مطابق حضرت موسیٰ پتھر کی دو سلوں پر کندہ کرکے لائے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریے کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے خدا کے کہنے پر ایک صندوق بنایا اور اس میں وہ پتھر کی تختیاں لاکر رکھی تھیں جو ان کو خدا نے کوہ سینا پر دی تھیں۔ تاریخ میں اس صندوق کو تابوت سکینہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں اس تابوت کی انتہائی اہمیت ہے۔ حضرت موسیٰ کے بعد بھی اس میں حضرت ہارون کے تبرکات ، کچھ من و سلویٰ، حضرت سلیمان کی انگوٹھی اور اس کے علاوہ دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ السلام کے تبرکات وغیرہ سب سامان رکھا گیا۔ یہ دس احکام بائبل کی کتاب خروج (Exodus) میں موجود ہیں۔ ان احکام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اول جو خاص خدا سے متعلق ہیں۔ دوم جو بنی نوع انسان کے متعلق ہیں۔ مختصر طور پر یہ احکام حسب ذیل ہیں۔

- خدا کو وحدہ لاشریک جاننا
- بت پرستی سے قطعی پرہیز کرنا
- خدا کے سوا کسی اور کے آگے سجدہ نہ کرنا
- خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا (یعنی بے فائدہ قسم نہ کھانا)
- سبت کے دن کو پاک ماننا۔ ان پانچ احکام کا خلاصہ حضرت مسیح علیہ الصلوۃ والسلام نے اس طرح بیان کیا ہے۔ اپنے خداوند سے اپنے سارے مال اور اپنی ساری جان کے ساتھ پیار کرنا۔
- ماں باپ کی عزت کرنا
- قتل نہ کرنا

[1] یوسف ظفر۔ یہودیت۔ صفحہ 38۔ لاہور: احمد پبلیکیشنز۔ 2009

- بدکاری نہ کرنا
- چوری نہ کرنا
- پڑوسی یا کسی اور شخص کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا اور اس کے مال متاع یا بیوی کو اپنے اوپر حرام جاننا

حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو کوہِ طور پر قیام کو چالیس روز گزر گئے تھے۔آپ جب دس احکام لے کر اترے تو اپنی قوم کو سونے کے بچھڑے کی پرستش کرتے ہوئے پایا۔ آپ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے کچھ مفسدین نے سونے کا ایک بچھڑا بنایا اور لوگوں کو اس کی عبادت کی ترغیب دی۔ بنی اسرائیل مصر میں رہتے ہوئے غلامانہ ذہنیت کے حامل ہوچکے تھے اور مصر میں مظاہر پرستی کا مظاہرہ ایک طویل عرصے وہ دیکھتے چلے آرہے تھے۔چنانچہ بنی اسرائیل کی بڑی تعداد اس پرستش میں مشغول ہوگئی۔ بچھڑا بنانے کے اس جرم کو موجودہ بائبل حضرت ہارون علیہ الصلوۃ السلام کی طرف منسوب کرتی ہے۔جبکہ اسلامی مقدس کتاب قرآن مجید کے مطابق اس فعل کا مرتکب سامری تھااور حضرت ہارون ایسے کسی جرم سے پاک تھے۔

حضرت موسیٰ واپس آئے تو بہت خفا ہوئے اور حضرت ہارون علیہما الصلوۃ السلام سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے ان کو شرک سے بہت روکا تھا۔بائبل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے بچھڑے کے بت کو جلا کر اس کی راکھ سمندر میں بکھیر دی اور اس عمل کے مرتکبین کو سزائے موت دی۔

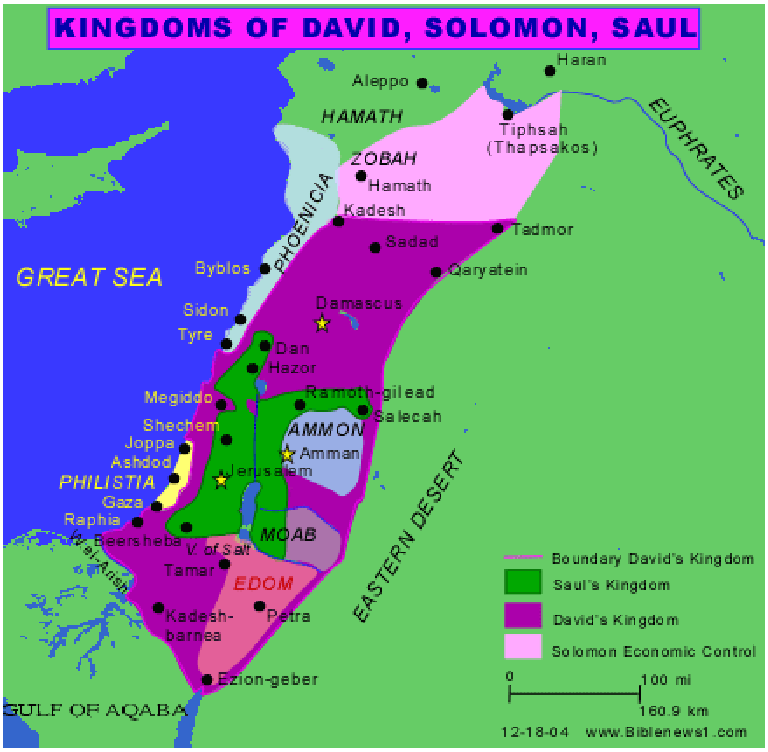
حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے انہیں بتایا خدا تعالیٰ نے انہیں فلسطین کی ارض مقدس (Holy Land) میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کو کہا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ ارضِ مقدس تمہیں ضرور ملے گا۔بنی اسرائیل کی قوم چونکہ ایک زمانے سے غلامی میں رہی تھی اس لیے ان میں جوش و ہمت اور مقابلہ کرنے کے قوت و صلاحیت ناپید تھی۔ سوائے دو افراد کے، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی بات کا انکار کرتے ہوئے یہ عذر کیا کہ جب تک وہ قوم اس علاقہ میں ہے ہم وہاں نہیں جائیں گے۔اس بات پر انہوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ بد کلامی بھی کی۔اس نافرمانی کے سبب چالیس سال تک صحرائے سینا میں دربدر گھومتی رہی۔یہ چالیس برس حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے عبادت الٰہی اور توبہ استغفار میں گزارے۔اس طویل عرصے میں وہ تمام لوگ فوت ہوگئے جنہوں نے آپ کی نافرمانی کی تھی۔ صرف وہی دو ثابت قدم افراد باقی بچے جن کے نام حضرت یوشع اور حضرت کالب علیہما الصلوۃ والسلام ہیں اور یہی حضرت موسی کے خلفائے راشدین ہوئے۔

چالیس سال کے عرصے میں بنی اسرائیل کی نئی نسل صحرا کے کھلے ماحول میں پل کر جوان ہوئی اور اس پر غلامی کے کوئی اثرات نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نئی نسل کو وہاں سے راستہ دکھایا اور بنی اسرائیل کنعان پہنچے جو موجودہ اردن اور فلسطین کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ موجودہ اردن کے پورے علاقے کی قومیں ان کے آگے ڈھیر ہوتی چلی گئیں اور اردن کا پورا علاقہ فتح ہو گیا۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے انتقال فرمایا اور بنی اسرائیل کے رہنما حضرت یوشع بنے جنھیں حضرت موسیٰ اپنی زندگی میں ہی اپنا جانشین مقرر کر گئے تھے۔ آپ نے آگے بڑھ کر پورے فلسطین کو فتح کر لیا۔ اس نئی سلطنت کو آپ نے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں تقسیم کر دیا اور یہاں بارہ قبائلی ریاستیں بنیں۔ بنی افراہیم (یعنی حضرت یوسف علیہ الصلوۃ السلام کی اولاد) کو دوسرے قبائل پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل تھی کہ ان کے کاہن (Priests) مذہبی امور میں فیصلے کے حق رکھتے تھے۔ یہ پورا دور (تقریباً 1220BC سے لے کر 1033BC تک) قاضیوں کا دور کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان پر جمہوری قبائلی حکمران حکومت کرتے تھے جو کہ "قاضی(Judge)" کہلاتے تھے۔

اس دور میں بنی اسرائیل کے علاقوں میں اگرچہ توسیع ہوتی رہی مگروہ بحیرۂ روم کے ساحل کا درمیانی علاقہ اور مغربی پہاڑی سلسلوں پر اپنا تسلط قائم نہ کرسکے۔ اس علاقوں میں فلسطینی آباد تھے جو یونانی النسل جنگجو قوم تھی۔ بنی اسرائیل کو ان سے جنگ میں اکثر شکست کھانی پڑی۔ اس دور میں بنی اسرائیل کی حکومت میں توسیع و ترقی زیادہ نہ ہوسکی۔ ان کی حکومت انتہائی قلیل رقبے میں تھی تاہم معاشی طور پر یہ کافی مستحکم تھے۔ تاریخی اعتبار سے بنی اسرائیل کئی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی تھی لیکن اپنی نسلی و مذہبی وحدت کا شعور ان میں اب بھی موجود تھا، چنانچہ جب کبھی انہیں کسی قوم کی طرف سے حملے کا سامنا کرنا پڑتا، یہ لوگ متحد ہوجاتے۔ لیکن قریبی آبادیوں سے انہیں ہمیشہ ہی خطرہ رہا اور اکثر و بیشتر انہیں شکست کھانی پڑی اور بالآخر ان پر فلسطینی غالب ہوگئے۔

یہاں اس دور میں یہودیوں کی مذہبی حالت کا ذکر کرنا بھی غیر ضروری نہ ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ السلام کی اولاد کا قبیلہ افراہیم(Ephraim) مذہبی عبادات کے سلسلے میں ممتاز تھا اور اسی خاندان سے قاضی مقرر ہوا کرتے تھے۔ یہ قاضی صرف مذہبی و معاشرتی معاملات ہی نہیں بلکہ ریاستی معاملات بھی چلایا کرتے تھے۔ حضرت یوشع علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے وصال کے وقت انہیں قوانین الٰہیہ کی پیروی تلقین کی۔ موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی دعاؤں کے طفیل انہیں ارضِ مقدس پر دوبارہ تسلط نصیب ہوا لیکن انہوں نے انہی موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی شریعت کو پس پشت ڈال دیا اور دوسری قوموں کی بت پرستی کو اپنا شعار بنا لیا۔ جہاں وہ خود کو ابراہیم ، اسحاق اور یعقوب علیہم الصلوۃ السلام کے گھرانے سے نسبت کی بدولت اقوام عالم پر اپنی فضیلت کو لازم سمجھتے تھے وہیں اپنے لیے نجات و فلاح کا جواز بھی تراش لیتے تھے۔ خدا تعالیٰ

جب انہیں ان کے گناہوں کی سزا میں مبتلاء کرتا وہ توبہ و استغفار کرتے اور خدا سے رحمت سے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرتے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں وہ دوبارہ اپنی نافرمانیوں پر لوٹ آتے۔



http://www.biblenews1.com/maps/maps.html (ac. 31 Oct 2012)

پہلا دورِ عروج

ارض مقدس پر فلسطینیوں کا قبضہ ہوچکا تو ان کے بزرگ ایک بار پھر خدا کی طرف رجوع ہوئے اور خداوند نے ان کی طرف ایک اور پیغمبر سموئیل علیہ الصلوۃ السلام کو مقرر کیا۔حضرت سموئیل نے سب سے پہلے ان کی مذہبی اصلاح کی اور انہیں ایک خدا کی اطاعت و پرستش پر دوبارہ لائے۔انہوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا وعدہ سنایا کہ اگر تم لوگ ان بتوں کو توڑ کر ایک خدا کی عبادت میں مشغول ہوگے تو خدا تمہیں دوبارہ عزت و کامرانی عطا کرے گا اور فلسطینیوں سے آزاد کروا دے گا۔چنانچہ ایک بار پھر یہود خدا کی طرف رجوع ہوئے۔حضرت سموئیل نے اپنے زیر نگرانی ساؤل (-1077 1049BC) کو ان کے لیے بادشاہ مقرر کیا جنہیں طالوت بھی کہا جاتا ہے۔ساؤل کی حکومت میں بھی فلسطین اور اسرائیلی قوم کے مابین جنگ ہوئی جس میں اسرائیلوں کو ہی فتح ہوئی۔ ساؤل کے بعد حضرت داؤد اور ان کے بعد حضرت سلیمان علیہما الصلوۃ السلام تخت نشین ہوئے۔موجودہ تورات اور یہودیوں کی دوسری مقدس کتابیں حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام کو اگرچہ پیغمبر قرار دیتی ہیں لیکن ان کی زندگی کی جو تصویر جوہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں اس میں ان کی

پیغمبرانہ حیثیت سے زیادہ بادشاہت نمایاں ہے۔

حضرت داؤد علیہ الصلوۃ السلام (c. 1040-970BC) خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے جنھیں زبور نامی کتاب عطا کی گئی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ الصلوۃ السلام (1000-930BC) حاکم ہوئے۔یہ بھی خدا کے پیغمبر تھے جنھیں بنی اسرائیل کے لیے مبعوث کیا گیا۔ قرآن مجید اور بائیبل کے مطابق خدا تعالیٰ نے انہیں کئی معجزات عطا کیے تھے، ان کی سب سے اہم خصوصیت میں یہ بیان ہوتی ہے کہ ان کی حکومت صرف انسانوں پر نہیں بلکہ جنات پر بھی تھی۔ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی تعمیر بھی حضرت سلیمان علیہ الصلوۃ السلام نے جنات کی مدد سے ہی کی جو بڑے بڑے پتھر اور موتی سمندر سے نکال کر لایا کرتے تھے۔ فلسطین میں واقع یہ بیت المقدس جسے القدس بھی کہا جاتا ہے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا قبلہ تھا۔ آج بھی یہ مقام عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں تینوں کے نزدیک یکساں مقدس ہے۔ بیت المقدس یہودی تاریخ میں ہیکل سلیمانی کے نام سے موسوم ہے۔

The Kingdoms of Israel and Judah, 924 to 722 B.C.



http://www.americanbible.org/content/images/The_Kingdoms_of_Israel_and_Judah__1_2_4152.jpg (28 Feb 2013)

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما الصلوۃ السلام کے دور میں بنی اسرائیل کو پہلا عروج حاصل ہوا اور ان کی قیادت میں بنی اسرئیل نے اپنے تمام قریبی مخالفوں پر تسلط قائم کرلیا۔ان کے زمانے میں یروشلم کی دولت اور عظمت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور بنی اسرائیل دنیا میں ایک ممتاز قوم کی حیثیت سے رہی۔لیکن حضرت سلیمان علیہ الصلوۃ السلام کے وصال کے بعد جب ان کا بیٹا رحبعام تخت نشین ہوا۔بنی اسرائیل کے دس قبائل نے اس کی اطاعت قبول نہ کی اور دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔یہودی تاریخ کے مطابق اس بغاوت کی وجہ بھاری ٹیکس تھا۔دس قبائل نے اپنی علیحدہ حکومت اسرائیل کے نام سے قائم کی جس کا مرکز سامریہ مقرر ہوا ، جبکہ ایک قبیلہ یہوداہ دوسرا بن یامین (Benjamin) نے کوئی مخالفت نہ کی،یہ حکومت یہوداہ کہلائی اور ان کا صدر مقام بدستور یروشلم ہی رہا۔[1] اسرائیلی حکومت موجودہ لبنان کے بیشتر علاقوں پر قائم تھی۔ان دونوں میں ہمیشہ جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا۔

ہمارے پاس اس دور میں یہود کی مذہبی حالت جاننے کا بہترین ذریعہ یہودی مقدس کتاب میں پیغمبر یسعیاہ علیہ الصلوۃ السلام کے صحیفے اور کتاب سلاطین ہے۔ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے بنی اسرائیل کے اخلاقی انحطاط کی تصویر کافی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ان کے مطابق یہود اس دور میں ایک بار پھر بت پرستی میں مبتلاءہوگئے تھے۔ان کا سب سے بڑا معبود بعل تھا جس کے کئی پجاری ہوتے تھے۔اس بت کی پرستش کی صورت یہ نکلی کہ اسرائیل کے بادشاہ اخی اب مشرک شہزادی ایزبل سے شادی کی اور بعل دیوتا کی پوجا کرنے لگا۔اس صورت حال میں اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس علیہ الصلوۃ السلام (Elijah) اور ان کے ساتھی الیسع علیہ الصلوۃ السلام (Elisha) کو مبعوث کیا۔ان دونوں پیغمبروں نے بادشاہ اخی اب کو توحید کی دعوت دی، لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ توحید کی طرف لوٹتے، انہوں نے ایلیاہ علیہ الصلوۃ السلام کے قتل کی کوششیں شروع کردیں۔ چنانچہ انہیں ملک چھوڑ کر جانا پڑا۔یہودی مورخین کے مطابق انہیں آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا۔ایزبل نے اپنے مشرکانہ مذہب کو پھیلانے کے لئے ان پیغمبروں کے ساتھیوں قتل کروانا شروع کر دیا۔

اس دور میں یہوداکی ریاست میں بھی کئی انبیاءمبعوث ہوئے ، حتیٰ کہ ایک ہی وقت میں کئی پیغمبر ہوتے تھے۔ان انبیاءمیں حزقیاہ، عاموس، یرمیاہ، یوایل اور بہت سے دیگر انبیاء علیہم الصلوۃ السلام شامل ہیں۔

بابل کی غلامی

بنی اسرائیل اس قدر اخلاقی انحطاط اور باہمی خانہ جنگی میں مبتلا تھے کہ پیغمبروں کی کثرت کے باوجود وہ صحیح راہ پر نہ

[1] اخلاق احمد قادری۔ تاریخ عالم۔ صفحہ 156۔ کراچی: سٹی بک پوائنٹ (2011)

آئے اور ان پر عراقی قوم آشوریوں کے حملے جاری رہے۔اسی قوم کے ایک بادشاہ سرجون دوم (722-705BC)نے اسرائیل کی شمالی ریاست پر حملہ کرکے اس کے دارالحکومت سامریہ کو تباہ و برباد کردیا۔دیگر حملوں کی نسبت یہ کافی بڑا معرکہ تھا اس میں بنی اسرائیل کے دس ذیلی قبائل کو شام سے جلاوطن کردیا۔ان قبائل کو اس نے اشور اور میڈیا کے درمیان آباد کیا، جو تاریخ میں گم شدہ قبائل کہلائے۔سامریہ کو زیر کرنے کے ساتھ ہی سرجون نے ریاست یہوداکی حکومت کو بھی اپنا باج گزار بنالیا تاہم یہ حکومت قائم رہی۔اس دور میں بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت یرمیاہ علیہ الصلوۃ السلام کو مبعوث کیا گیا ، انہوں نے یہود کو دوبارہ متحد کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے اپنی دعوت پیش کی ، اس دعوت کی ایک بہترین جھلک یروشلم کی تباہی پر یرمیاہ علیہ الصلوۃ السلام کا وہ نوحہ ہے جو تورات میں بہترین ادب کی حیثیت سے ممتاز ہے۔لیکن بنی اسرائیل نے اس عظیم نبی کی دعوت پر لبیک کہنے کے بجائے ان پر ظلم شروع کردیا ، انہیں کنویں میں لٹکادیا۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں صدقیاہ (Zedekiah 597-586BC)یہوداہ کا بادشاہ بنا جو یہوداہ سلطنت کا آخری حکمراں ثابت ہوا۔اس نے گیارہ برس حکومت کی،لیکن اس کے دور میں یہودا سلطنت باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے انتہائی کمزور ہوچکی تھی۔حکومت کے گیارہویں برس بعد بابل کے بادشاہ نبوکدنصر (Nebuchadnezzar 634-532BC) نے یروشلم پر حملہ کردیا۔بادشاہ نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا اور کو قید کرلیاگیا۔اس کی آنکھیں نکلوادیں اور اس کے سامنے اس کے بیٹوں کو بھی ذبح کردیا گیا۔اس خانہ جنگی میں تورات کے نسخوں کو بھی جلا دیا گیا اور بنی اسرائیل کی تاریخ ضائع کردی گئی۔ہیکل سلیمانی جو چار صدیوں سے بنی اسرائیل کا سرمایہ افتخار تھا، اس نے اسے بھی آگ لگا کر راکھ کردیا۔یہدویوں کا قتل عام کیاگیااور تمام محلات و باغات اور یروشلم کے اطراف میں قائم فصیل بھی تباہ کردی۔بنی اسرائیل کو ایک بار پھر بخت نصر کے ہاتھوں اسیر ہوکر بابل جانا پڑا۔یہاں یہ لوگ پچاس برس غلامی میں رہے۔[1]

اس عہد غلامی میں اہل یہود نے کئی مشکلات کا سامنا کیا، کئی صعوبتیں برداشت کیں لیکن وہ اپنے مذہبی افتخار اور شناخت کو کبھی نہیں بھولے، بلکہ اس غلامی نے ان میں یہ جذبہ مزید پیدا کردیا کہ وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں۔اس دور میں ان کے ہاں حزقی ایل، دانیال اور عزیر علیہم الصلوۃ السلام مبعوث ہوئے جنھوں نے بنی اسرائیل کو توحید سے جوڑے رکھا اور انہیں مستقبل کے ایک نجات دہندہ مسیح کے ذریعے دوبارہ عروج کی امید دلائی۔اسی دور میں صیہونیت کی پہلی

[1] اخلاق احمد قادری۔تاریخ عالم۔صفحہ 229۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ(2011)

تحریک اٹھی جس کا آغاز زردبابل بن سالتی (Zerubbabel the son of Shealtiel)نے کیا۔اس تحریک کا مقصد یروشلم کی دوبارہ بازیافت اور ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر تھا۔ہیکل موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہودی عبادت گاہیں شول (Synagogue) بھی اسی دور میں بننے لگیں۔

دوسرا دورِ عروج

جب بنی اسرائیل اپنی غلطیوں کی سزا بھگت چکے تو انہیں ایک بار پھر خداوند نے عروج کا موقع دیا۔یہ عروج اس دور کے ایک اہم فاتح سائرس اعظم(Cyrus the Great 576-530) کے توسط سے ہوا ، جنہیں خورس اعظم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔یہ قدیم ایران کے بادشاہ تھے جنہوں نے ایران میں اخامنشی(Achaemenic) سلطنت کی بنیاد رکھی۔سائرس کی قیادت میں ایران نے مغربی ووسطی ایشیا ، یورپ کے کچھ علاقے ،کوہ قاف یعنی آرمینیا، بحیرہ روم اور مشرق میں دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کرکے اس وقت تک کی تاریخ کی عظیم ترین سلطنت قائم کی۔ 536BC میں سائرس نے بابل کو زیر کرکے ان یہودیوں کو رہا کردیا اوریہ لوگ اپنے وطن واپس لوٹے، تاہم ایک بڑی آبادی یہی مقیم رہی۔لوٹنے والے یہودیوں نے ایران کے تحت یہودیہ سلطنت ازسرنو قائم ہوگئی۔ایرانیوں نے مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں کو ان کے مذہبی معاملات میں آزاد چھوڑ دیا۔اسی وجہ سے سائرس کو یہودیت میں بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔[1]

اس دور کے بعد یہود کے ہاں حضرت عزیر (عزرا) علیہ الصلوۃ السلام (480-440BC) کی بعثت ہوئی۔آپ تاریخِ بنی اسرائیل میں ایک مجدد اور احیائے دین کے ایک بڑے رہبر سمجھے جاتے ہیں۔انہوں نے تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو دوبارہ تصنیف کیا، اور بنی اسرائیل کی دینی و اخلاقی تربیت کی۔حضرت عزیر علیہ الصلوۃ السلام نے بنی اسرائیل سے اپنے گذشتہ گناہوں پر اجتماعی توبہ کروائی ، بنی اسرائیل نے خداوند کے حضور اپنے گناہوں کی معافی طلب کی، یہ توبہ نامہ بائبل کی کتاب توبہ نامہ میں درج ہے۔عزیر علیہ الصلوۃ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت انہی کے دور میں نحمیاہ علیہ الصلوۃ السلام نے کی۔آپ کو ایران کے بادشاہ ارتخششتا یااردشیر اول(Artaxerxes r. 465-424BC)نے یروشلم کا حاکم مقرر کیا۔پیغمبر نحمیاہ علیہ الصلوۃ السلام نے بھی بنی اسرائیل میں خدائی قوانین نافذ کیے اور ان کی تربیت جاری رکھی اور اس دور میں بنی اسرائیل کو پھر سے عروج حاصل ہوا۔چونکہ اس دور میں یہودیوں نے اپنے گناہوں سے اجتماعی توبہ

---

[1] ایضاً

کرچکے تھے اس لیے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی خاص مدد کی۔ شاہِ ایران کے ساتھی ہامان نے یہودیوں کے قتل کی سازش بھی کی لیکن خداتعالیٰ نے اس کی سازش ایران کی ملکہ آستر کے ذریعے ناکام بنا دی۔ اس واقعے کی تفصیل بائبل کی کتاب آستر میں موجود ہے۔ اسی دور میں بنی اسرائیل کے ایک مشہور پیغمبر ایوب علیہ الصلوۃ السلام کی بعثت بھی ہوئی جن کے حالات بائبل اور مسلمانوں کے ہاں قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔

اس زمانے کی مذہبی حالت کا اندازہ اس دور میں مرتب ہونے والی بائبل کی کتابیں امثال اور واعظ سے ہوجاتا ہے، جس کے مطابق ان کے ہاں اس دور میں رہبانیت رواج پارہی تھی۔ یروشلم کے آباد ہونے کے ساتھ ہی ہیکل بھی مذہبی مناجاتوں سے گونجنے لگا تھا۔ ایرانی حکومت کے تحت یہودیوں کی ریاست تقریباً 333BC تک بہ اطمینان قائم رہی لیکن اس کے بعد یونانی فاتح سکندر (Alaxander 356-323BC) نے فلسطین پر حملہ کیا اور بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا۔ یہ غلامی یہود کی مذہبی حالت کو دوبارہ بگاڑنے کا سبب بنی۔ یونان کے زیر تسلط رہ کر انہوں نے یونانی تہذیب کے عناصر کو خود میں جذب کرلیا تھا۔ پھر 175BC میں یونانی حکمران انطوکس چہارم (Antiochus 215-164BC) تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی حکومتی قوت سے یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کی کوشش کیں جس کے ردعمل میں مکابی تحریک اٹھی۔

مکابی بغاوت *(Maccabean Revolt)*

انطوکس نے تورات کی شریعت پر عمل کرنے پر پابندی لگادی تھی اور یہودیوں کو ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی سے روک دیا تھا، حتیٰ کہ گھروں میں تورات کا نسخہ رکھنے والوں کے لیے سزائے موت تجویز کی۔ بیت المقدس کے ہیکل میں زبردستی بت رکھوائے اور یہودیوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کی پرستش کریں۔ اس یہودی مذہب کی تمام ظاہری رسم و روایات کو ختم کرنے کی سعی کی۔ اس نے تمام یہودی قوانین منسوخ کرکے یونانی قوانین عائد کردیے۔ انکار کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھی، اسی وجہ سے یہودی قوم کا امیر طبقہ یونانی تہذیب کو فروغ دینے لگا تھا، مگر روایت پسند یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان میں ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ انطوکس کے جبر کے خلاف یہ ایک زبردست ردعمل تھا۔ اس تحریک کے زیر اثر بڑی کشت و خون کے بعد 140BC میں انہوں نے کامیابی کے ساتھ ایک آزاد دینی ریاست "یہودیہ (Judea)" قائم کرلی جو 63BC تک قائم رہی۔ انہوں نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا اور ہیکل سلیمانی کو بتوں سے پاک کیا، اور اس خوشی میں یہودیوں نے شاندار

جشن منایا۔اس واقعے کی یادگار میں اہل یہود آج بھی ہنوخ نامی تہوار مناتے ہیں۔[1]

مکابیوں کی تحریک جس جوش و حمیت کے ساتھ اٹھی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی اور اس کی جگہ ظواہر پرستی نے لے لی۔خدا سے تعلق صرف عبادات تک رہ گیا تھا۔چھوٹے چھوٹے ظاہری احکام پر تو سختی سے عمل کرتے لیکن دوسرے اخلاقی ہدایات سے چشم پوشی کرلیتے۔جس کی سزا ایک بار پھر انہیں غلامی کی صورت ملی۔مشہور رومی فاتح پومپی نے 63BC میں یہودی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔تاہم اپنی حکومتی پالیسی کے تحت اس نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک چھوٹی ریاست قائم کردی جو بالآخر 40BC میں ایک یہودی ہیرودکے قبضے میں آئی۔اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کرکے یہودیوں کو خوش رکھا، دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر رومی سلطنت کی وفاداری کا مظاہرہ کرکے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔اس نظام کے تحت فلسطین میں دو حاکم ہوتے تھے، ایک حاکم رومی ہوتا تھا جو حکومتی انتظامات کو دیکھتا تھا، دوسرا حاکم یہود کی طرف سے ہوتا تھا جس پر مذہبی امور کی ذمہ داری تھی۔اس اختلاط کی بدولت یہودی پوری طرح رومی اور یونانی تہذیب سے متاثر ہوچکے تھے۔اس زمانے میں یہود کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہیرود کے بیٹا ہیرود اینٹی پاس (Herod Antipas 20BC-39CE) جو اس وقت شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اورمشرق اردن کا حاکم تھا، اس نے اپنی سوتیلی بیٹی کے رقص سے متاثر ہو کر اس کی فرمائش پر سیدنا یحیٰ علیہ الصلوۃالسلام کو شہید کروا دیا۔[2]

دوسرا زوال

اس دورکے شام کے حاکم کراسس(Crassus r. 55-38BC) نے ہیکل سلیمانی کی طرف رخ کیا اور اسے لوٹ کر واپس چلا گیا۔یہود نے اس کے خلاف بھی بغاوت کی تو ان کی بغاوت کے جواب میں تیس ہزار یہودیوں کو غلام بناکر بیچ دیا گیا۔رومن چرچ کے یہود میں سے اکثریت انہی یہودی غلاموں کی اولادوں میں سے تھی۔اس جلاوطنی سے پہلے ہونے والے مظالم کی وجہ سے یہودی قوم کی مختلف جماعتیں یورپ ، ایشیاءمیں فرات اور دجلہ کے کنارے پہنچ چکی تھیں۔ مورخین کے مطابق گم شدہ قبائل میں سے بھی ان کی ایک جماعت افغانستان اور ایران بھی گئی۔عرب میں بھی حبشہ اور شام کے علاقے میں یہود آباد تھے، چنانچہ بنی اسرائیل کے یہ لوگ یونان اور روم کے تہذیبی اثرات کے ہمراہ یورپ اور

[1] Warren Matthews.World Reliogions. Page 259. Canada: Cengage Learning, 2011

[2] اخلاق احمد قادری۔تاریخ عالم۔صفحہ 428۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ(2011)

ان علاقوں میں منتشر ہو کر آباد ہو گئیں۔

40BC میں ایرانیوں نے فلسطین پر حملہ کیا، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد 37BC میں ہیرود اعظم نے اس کا مقابلہ کیا جو کہ اس وقت فلسطین کا بادشاہ تھا۔ہیرود نے یہود کو اگرچہ علیحدہ سلطنت نہیں دی لیکن اس نے ان کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے انہیں خوشحالی اور سکون میسر کیا۔اس نے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرایا اور 4BC تک اطمینان سے مسند حکومت پر براجمان رہا۔

عیسائیت کا عروج

پہلی صدی عیسوی میں یہود کی حالت قدرے بہتر تھی، انہوں نے ریاست نے اپنی مسلمہ حیثیت تسلیم کرچکی تھی، لیکن یہود نے ہیرود کے بعد کئی بغاوتیں کیں جنہیں رومیوں نے فرو کر دیا اور بے شمار یہودیوں کو قتل کیا۔اس کے بعد کا دور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کا ہے جو خاص بنی اسرائیل کی طرف بھیجے جانے والوں میں سے آخری پیغمبر تھے۔حضرت عیسیٰ سے بنی اسرائیل کے رویے کے متعلق ہم عیسائیت کے تحت تفصیل سے پڑھیں گے۔ تاہم یہ جاننا ضروری ہے یہود کی اکثریت نے ان کی پیغمبری کا انکار کیا اور یہودیہ کے رومی گورنر پائلٹ (r. c. 36-26CE) نے (یہودی اور عیسائی عقیدے کے مطابق) انہیں صلیب چڑھاکر قتل کر دیا۔حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے بعد بنی اسرائیل پر عروج کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو کر رہ گیا۔

یہود نے دوبارہ 60CE کے عشرے میں رومی سلطنت سے بغاوت کی۔ جس کے نتیجے میں رومی جرنیل ٹائٹس ان پر مسلط ہوا اور اس نے 70CE میں یروشلم فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اسرائیلیوں کے 133,000 افراد قتل کئے گئے اور 67,000 افراد کو غلام بنا لیا گیا۔ان کی لڑکیوں کو فاتحین کی عیاشی کے لئے رکھ لیا گیا۔ہیکل سلیمانی کو رومی فوج نے ایک بار پھر جلاکر خاکستر کر دیا اور یہودیوں کے بے تحاشہ ظلم کیے گئے۔اس دور میں بنی اسرائیل کو پوری دنیا میں جلا وطن کر دیا گیا۔یہود کی تاریخ میں اسے بنی اسرائیل کی دوسری جلاوطنی (Second Diaspora) کہا جاتا ہے۔اس دور کے بعد سے تورات کے علما "ربی(Rabbi)" کہلاتے ہیں اور اس دور کو "ربانی دور(Rabbinic Period)" کہا جاتا ہے۔

یروشلم کی تباہی کے بعد یہودیت کی کسمپرسی کو دیکھتے ہوئے 70CE میں ہی فلسطین کے ایک ساحلی شہر جامنیا میں ایک ربی (یعنی تورات کا عالم) یوحنا بن ذکائی (CE 30-91) نے ایک درس گاہ قائم کی۔اس درس گاہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہیکل کے تباہی کے بعد یہود کسی نہ کسی طرح اپنے مذہب سے قائم رہے اور یہودی علماء باہم متحد رہیں۔بعد ازاں یہاں ایک

کونسل قائم کی گئی جس کا مقصد یہودی قوم میں نئی روح بیدار کرنا اور انہیں متحد کرنا تھا۔100CE میں اس درس گاہ کو جمالیل ثانی (45-115CE) نام کے ایک ذہین سربراہ نصیب ہوئے جو قومی حمیت کے داعی بن کر ابھرے۔ انہوں نے یہودی قوم کو متحد کرنے کے لیے کئی کوششیں کیں۔ جمالیل ثانی کے ہی دور میں اس کونسل نے رائج الوقت تورات پر نظر ثانی کر کے انہیں دوبارہ مرتب کیا۔ یہاں کے ربیوں نے اپنے اجتہادات کے مطابق ہیکل سلیمانی سے متعلقہ رسومات کو غیر لازم قرار دے دیا اور ان کی جگہ تلاوت، دعا اور انفرادی اعمال کو مرکزی اہمیت دی۔ اس طرح اگرچہ یہودیت کی ظاہری صورت قدیم یہودیت سے مختلف کر دی گئی لیکن ہیکل کے معدوم ہونے کے باوجود یہودیوں کا سلسلہ اپنے مذہب سے قائم رہا۔[1]

یہودی ایک طویل عرصے تک روم کے زیر تسلط دبے رہے۔لیکن ایک بار پھر یہودیوں پر ظلم شروع ہوا۔رومی بادشاہ ہیڈریان (r. 117-138) روم کے مشرکانہ مذہب کا زبردست حامی تھا، اس نے اپنا مذہب زبردستی نافذ کرنے کے لیے یہود پر ظلم کیا۔ختنہ کی ممانعت کردی اور ہیکل سلیمانی کے مقام پر مقامی دیوتا کا مندر تعمیر کروادیا، اور یہودیوں کو یروشلم سے باہر نکال دیا گیا۔البتہ ہیڈریان کے بعد دوسرے رومی بادشاہوں نے یہود کے ساتھ یہ رعایت برتی کہ انہیں فلسطین میں اوشا کے مقام پر ایک مدرسہ بنانے کی اجازت دے دی۔ اس مدرسہ میں یہود خاندان ربی کو خاص مقام حاصل تھا، انہوں نے ایک یہاں ایک کونسل بنا لی جس کا سربراہ بطریق (Patriarch) کہلاتا تھا۔اس کونسل اور بطریق کے اختیارات کو بعد ازاں رومی حکومت نے بھی تسلیم کرکے قانونی حیثیت دے دی۔

ہیکل کی تباہی کے بعد یہودی شریعت کا ایک بڑا حصہ جو ہیکل میں ادا کی جانے والی مذہبی رسومات سے متعلق تھا، اب یہود کے لیے زیادہ اہم نہ رہا تھا۔چنانچہ اب انہوں اپنے لٹے ہوئے مذہبی و ادبی سرمائے کو دوبارہ مرتب کرنے کی کوششیں کی یہودیت کو وسعت و معنویت دینے میں مشغول ہوگئے۔ اس عہد کو "ربانی دور(Rabbinistic Period)" کہا جاتا ہے۔ یروشلم کی تباہی کے بعد سے اب تک یہودی مختلف حالات سے گزرے تھے جس میں ان کے علماءنے مختلف اجتہادات کیے تھے، یہودیوں نے شریعت موسوی کے متعلق ہونے والے ان اجتہادات کو جمع کرکے ایک فقہی مجموعہ مشنا (Mishnah)" مرتب کیا۔ یہود کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام نے تورات دو طرح سے دی ہے: ایک تحریری اور دوسرے زبانی۔ اس زبانی تورات کو تحریر کرکے مشنا کی شکل دے دی گئی۔ یہ مشنا حضرت موسی اور بعد کے انبیا کی احادیث اور یہودی علما کے اجتہادات کا مجموعہ تھا۔

---

[1] یوسف ظفر۔ یہودیت۔ صفحہ 120۔ لاہور: احمد پبلیکیشنز۔ 2009

چوتھی صدی عیسوی میں رومی حکومت کا عیسائیت قبول کرنے کے بعد یہودیوں کو عیسائی حکمرانوں کی جانب سے سخت رویے کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ عیسائی عقیدے کے مطابق یہود ہی حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے قتل کے ذمہ دار تھے۔ بعض مورخین بعد کی صدیوں میں یہودیوں کے قتل عام اور بالخصوص جرمنی کے ہولو کاسٹ کو بھی اسی سے نسبت دیتے ہیں۔عیسائی حکومت کے تحت یروشلم سے یہودیوں کو باہر کرنے کے بعد بیت المقدس کا یہ علاوہ ان کے لیے ممنوع کر دیا گیا تھا۔

ڈیڑھ ہزار برس پر محیط تاریخی انقلابات نے یہودیوں کو مذہبی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کردیا تھا۔ایک گروہ وہ جو فلسطین میں رہا تھا۔یہ لوگ فلسطین میں غلامی کی زندگی گزارتے ہوئے سخت گیر اور مذہب میں شدت پسند ہو چکے تھے ، جبکہ دوسرا گروہ بابلی یہودیوں کا تھا، جو بابل اور ایران میں امن سے رہ رہے تھے۔ان کے ہاں مذہبی شدت پسندی کم اور دیگر اقوام سے میل جول کی بدولت مذہب میں لچک زیادہ تھی۔

425CE میں جب رومی حکومت نے یہودی بطریق کے نظام کو ختم کردیا تو یہود کی مذہبی ذمہ داری بابل کے یہود پر پڑی۔ چنانچہ 500CE کے لگ بھگ یہودی فقہ مشنا کی ایک تفسیر لکھی گئی جو کہ گمارا(Gemara) کہلائی۔ اس تفسیر میں مزید احادیث اور اجتہادات اکٹھے کیے گئے۔ ان دونوں کے مجموعے کو بابلی تالمود(Babylonian Talmud) کہا جاتا ہے جو تورات کے بعد یہودیوں کی مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔اس دور کی تاریخ کی اہم بات یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہود اس وقت تک زراعت، تجارت ، سرمایہ کاری اور تبادلۂ زر کے معاملے میں ماہر ہو چکے تھے۔تالمود میں ہمیں خاص کر معاشی احکام بکثرت ملتے ہیں۔بلاشبہ یہ تالمود مرتب کرنے والے علماء کا ہی کارنامہ تھا کہ یہود اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے خیرات کرنے میں فراخ دل ہوگئے۔ان کتابوں نے یہودیت کو دوبارہ بحال کرنے اور اس کے پیروکاروں کو دوبارہ یکجا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس تاریخی موڑ نے فلسطینی یہودیت کو کئی دبیز پردوں میں چھپا دیا اور بابلی تالمود ہی موجودہ یہودیت کا شعار قرار پایا۔ یہ دور ربیوں کا دور(Rabbinic Judaism) کہلاتا ہے۔

وہ یہود جو رومی عہد میں یورپ اور جرمنی کی طرف ہجرت کرگئے وہ اشکنازی کہلائے۔یہ لوگ لکھنے پڑھنے اور بود باش میں عبرانی روایات کو قائم رکھے ہوئے تھے۔انہیں اکثر کسی نہ کسی عیسائی حکمراں کی طرف سے نفرت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔اسی وجہ سے یہ لوگ اکثر یورپ کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے ہجرت کرتے رہتے تھے اور یہ لوگ علمی و معاشی طور پر زیادہ مستحکم نہ ہوسکے۔دوسری طرف 70CE کے مظالم کے بعد یہودیوں کی ایک بڑی جماعت عرب آگئی

کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہ یہود سفرادیم کہلائے۔ عرب میں تبوک، تیماء، یثرب (مدینہ)، وادی القریٰ، فَدَک اور خیبر پر ان کا تسلّط قائم ہوا۔ ان کے قبائل بنی قریظہ، بنی نَضِیر اور بنی قینقاع مدینہ میں آباد ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہاں تشریف آوری کے وقت یہ وہاں موجود تھے۔ عرب آکر ان سفرادیم نے عربی تہذیب اور طرز معاشرت کو پوری طرح اپنا لیا تھا۔ ان کا رہن سہن نام وغیرہ بھی عربی میں ہی ہوا کرتے تھے، تاہم وہ عرب تہذیب قبول کرنے کے باوجود اپنی یہودی عصبیت نہیں بھولے تھے۔

یمن کی سرحد کے قریب واقع شہر نجران میں ایک زمانے سے عیسائی آباد تھے۔ 524 میں یہاں کا بادشاہ تبان اسعد ابو کرب ایک مرتبہ مدینہ گیا جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اس نے یہودی مذہب اختیار کرلیا۔ اپنے ساتھ بنی قریظہ کے دو عالموں کو لے کر وہ واپس یمن لوٹا اور یہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ذونواس اس کا جانشین ہوا اور اس نے نجران کے عیسائیوں پر یہودی مذہب اختیار کرنے کے لیے زبردستی کی اور کئی مظالم ڈھائے۔ آخر کار525 میں حبشی حکومت نے یمن پر حملہ کر کے ذونواس اور اس کی حمیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

ظہور اسلام

پانچویں صدی عیسوی کا آخری تاریخِ عالم میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس دور میں عرب میں نوعِ انسانی کے ایک اہم مذہب اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام کے ظہور کے وقت یہود عرب میں اچھی تعداد میں آباد تھے۔ اسلام کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (571-632) کے دور میں عرب یہودیوں کے مسلمانوں سے بعض معرکے بھی ہوئے لیکن جنگ خیبر کے بعد یہودیوں نے مسلمانوں کی اطاعت کو قبول کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے دور میں جب اسلامی فتوحات پھیلتے ہوئے ایران، عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ اور اسپین تک پہنچی تو یہاں کے یہودیوں نے مسلمان خلفاء کے ساتھ کسی متعصبانہ رویے کا اظہار نہ کیا۔ تاہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (r.634-644) کے دور میں مجاہدین شام کی طرف جاتے تو راستے میں خیبر بھی ایک پڑاؤ پڑتا تھا۔ یہودی ان موقعوں پر مجاہدین کا پانی بند کر دیتے اور ان کے خیمے جلا دیتے۔ بالآخر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں یہاں سے نکال دیا اور یہود اطراف میں آباد ہو گئے جہاں انہیں مکمل آزادی دی گئی۔ اس کے بعد عہد عثمانی (r.644-656) اور دیگر خلفاء کے دور میں بھی یہودیوں پر کسی قسم کی قدغن نہ تھی۔ وہ مذہبی، سماجی اور تمدنی طور پر بالکل آزاد تھے۔ خود اسلامی شریعت میں اہل کتاب سے جو معاملات برتے گئے ہیں، اس کی وجہ سے یہ مسلم ممالک یہودیوں کے لیے سازگار مسکن ثابت ہوئے۔

70CE میں یروشلم سے نکل کر جو یہود ہسپانیہ (اسپین) میں آباد ہوئے تھے، وہ پہلے عیسائی حکومتوں کے زیر سائے رہے۔ 711CE میں مسلمان فاتح طارق بن زیاد(d.720)نے ہسپانیہ فتح کیا اور مفتوحہ علاقے بنو امیہ کی سلطنت میں شامل ہو گئے اور یہاں کے یہود بھی مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئے۔ بعد ازاں 750CE میں عبد الرحمٰن(r. 756–788)نے ہسپانیہ میں اپنی الگ سلطنت قائم کی تو ہسپانیہ علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا جس میں یہود کو بھی خاص مقام ملا۔ بنو امیہ کے بعد یہاں یوسف بن تاشقین(r.1061-1106) نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے ایک مستحکم سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس عہد میں ایک مذہبی عالم نے یہ اعلان کیا کہ ہجرت کے بعد یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم مزید پانچ سو سال تک مسیح کا انتظار کریں گے اور اگر وہ اس عرصے کے دوران بھی ظاہر نہ ہوا تو اسلام قبول کر لیں گے۔ اس حساب سے انہیں 1107CE میں اسلام قبول کر لینا چاہیے۔ چنانچہ یوسف بن تاشقین نے مطالبہ کیا کہ یہود ہسپانیہ مسلمان ہو جائیں انہوں نے اسلام قبول نہ کیا بلکہ جزیہ دینے پر راضی ہوئے۔ اس کے بعد ہسپانیہ پر موحدین حکومت(1121-1269) کا تسلط ہوا۔ انہوں نے یہود و نصاریٰ کو اختیار دیا کہ مسلمان ہو جائیں اور آزادی سے زندگی بسر کریں یا پھر ریاست سے باہر نکل جائیں۔[1] کئی یہودیوں نے اسلام قبول کر لیا جبکہ اکثر شمالی سپین اور مصر ہجرت کر گئے۔

یہودیوں کا دوسرا اہم مرکز مصر تھا۔ یہ علاقہ 358CE میں مسلمانوں کی سلطنت فاطمیہ اور ان کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی (r.1174–1193) کے ہاتھ آیا۔ بنو امیہ کی طرح فاطمی اور ایوبی حکمران بھی انتہائی وسیع النظر تھے، چنانچہ انہوں نے یہود پر بہت سی نوازش کیں۔ یہودی جلاوطنی کے بعد مسلم دورِ حکومت یہود کے لیے علمی اعتبار سے بھی یورپی یہودیوں کے مقابلے میں کافی مبارک رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہسپانیہ میں بنو امیہ اور مسلم مین لینڈز میں بنو عباس کے دور حکومت کو تاریخ میں یہودیوں کا عہدِ زریں مانا جاتا ہے۔ ہمیں اس دور میں کئی یہودی ادیب، شاعر، طبیب، مفکر، فلسفی، تاجر نظر آتے ہیں۔ اندلس کی اسلامی تہذیب سے انہوں نے عقلی علوم میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا، مسلمان اور یہودیوں کی باہم مجالس ہوا کرتی تھیں جس میں وہ فلسفہ اور دیگر علوم پر بحث کیا کرتے تھے۔ اسلامی نظام حکومت کے تحت انہیں مذہبی، سماجی ، اقتصادی اور علمی آزادی حاصل تھی۔ مسلمانوں نے انہیں حکومتی سطح پر اعلیٰ عہدوں کے علاوہ دیگر معزز عہدے بھی سونپے اور اپنی افواج میں بھی بھرتی کیا۔ اس زمانے کے ایک زبردست یہودی عالم موسیٰ بن میمون (1135-1204) تھے جو یونانی اور مسلم فلسفہ کے ماہر تھے۔ یہودی ہونے کے باوجود انہیں مصر میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ایک وزیر کے کے ذاتی معالج اور دوست کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل تھا[2] اور غالباً انہی کی وجہ سے سلطان نے بعض یہودی خاندانوں کو یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت دی تھی۔

---

[1] یوسف ظفر۔ یہودیت۔ صفحہ 157۔ لاہور: احمد پبلیکیشنز۔ 2009

[2] Moses Ben Maimon. Jewish Encyclopedia. http://www.jewishencyclopedia.com/articles/11124-

انہوں نے یہودی شریعت پر کئی کتابیں لکھیں، جن میں سے اہم کتاب مشنا تورات "ہے جسے آج بھی یہودی شریعت میں خاص مقام حاصل ہے۔انہیں یہودی شریعت کا ایک اہم مجتہد مانا جاتا ہے اور آج ان کے ماننے والے بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ابراہیم ابن عزرا(1089-1167) مائیکل سروٹس (Michael Servetus 1511-1553)، سلیمان بن جبرائیل (1021-1058) اور ابن شپروت (Hasdai ibn Shaprut 915-975) جیسے مذہبی عالم، ماہر فلکیات و ریاضیات، شاعر ،فلسفی اور مفکر شامل تھے۔

مسلمانوں کی حکومت کے بعد 1492 میں جب اندلس (ہسپانیہ) پر عیسائی حکمراں فرڈیننڈ(r.1479 –1516) کا قبضہ ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہود پر بھی مظالم ہوئے، بے شمار یہودیوں کو قتل کیا گیا اور ہزاروں یہود جلاوطن کر دیے گئے۔[1] چنانچہ انہوں نے بھی اور عثمانیہ سلطنت کے زیر انتظام علاقوں میں پناہ لی۔دوسری جانب یروشلم اور یہودیہ میں موجود یہودیوں نے آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں تورات کو از سر نو ترتیب دیا۔عبرانی رسم الخط کے نقائص دور کرکے اس میں کچھ علامات کا اضافہ کیا۔

یہودیوں کی ایک بڑی تعداد بازنطیہ (Byzantine) سلطنت میں آباد تھی جو یونان ، اٹلی اور ایشائے کوچک (Anatolia) کے بعض حصوں تک پھیلی ہوئی تھی ۔ یہاں شروع میں یہود خوشحال رہے، حتیٰ کہ انہیں سرکاری عہدوں سے بھی نوازا گیا لیکن چھٹی صدی عیسوی کے بعد کے عیسائی بادشاہوں کا سلوک یہود کے ساتھ اچھا نہ رہا۔ ہر قل (r. 610-640) نے بازنطیہ کے خلاف ایران کا ساتھ دینے کی وجہ سے یروشلم سے نکال دیا۔[2] ساتویں صدی میں لیو سوئم (717-741) نے انہیں اس شرط پر آباد کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ عیسائی مذہب قبول کرلیں گے، چنانچہ بعض نے عیسائیت قبول کرلی اور بعض نے سزائیں برداشت کیں۔

دیگر خطوں میں جہاں یہودی آباد تھے مسلمانوں کی آخری بڑی حکومت سلطنت عثمانیہ (1399-1924) تھی۔ دیگر مسلم حکمرنوں کی طرح اس سلطنت کے دور میں بھی ان کے ساتھ جائز رویہ برتا گیا اور شاذ و نادر واقعات کے علاوہ کہیں ان کے حقوق کی پامالی نہ ہوئی۔عہد عثمانی میں یہود کا ایک مقبول فرقہ ڈون مے ساباتائین (Sabbateans) کی ابتداء بھی ہوئی۔یہ فرقہ ساباتائی زیوی سے منسوب ہے جس نے 1666 میں مسیح موعود (Promised Messiah) ہونے کا دعویٰ کیا۔یہودیوں نے چونکہ

---

moses-ben-maimon (28 Feb 2013)

[1] Sara E. Karesh and Mitchell M. Hurvitz, Encyclopedia of Judaism, p492, USA: Infobase Publishing

[2] Gerrit Jan Reinink , Bernard H Stolte and others,The reign of Heraclius, p189, Leuven: Peeters Publisher (2002)

حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کو مسیحا نہیں مانا، اس وجہ سے ان کے اندر یہ تصور موجود تھا کہ ایک مسیحا آ کر انہیں غلامی سے نجات دلوائے گا۔۔ بعض یہودیوں نے اسے قبول کیا لیکن ربیوں کی اکثریت نے ان کی مخالفت کی۔بعد ازاں اس وقت کے عثمانی حکمراں سلطان محمد رابع (r. 1648-1687) نے سباتائی کو اپنے دربار میں بلوایااور اپنی جان بچانے کے لیے معجزہ دکھانے کو کہا تو سباطائی نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے کئی مریدین ان سے بد ظن ہوگئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ سلطان کی ہی خدمت میں رہے اور کئی علمی کتابوں کے ترجمے کیے۔ انہوں نے بھی اپنے عقیدت مند مریدوں کو یہودی تصوف، جو کبھقبالہ کہلاتا ہے، سے متعارف کروایا۔ ان کے ماننے والے آج بھی ترکی میں پائے جاتے ہیں۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور یہود

پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں علوم یورپ میں احیاءعلوم اور نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ یورپ کی اس رونق سے اگرچہ یہود کی مذہبی روایات پر کوئی واضح فرق نہیں ہوا، تاہم یہود چونکہ معیشت میں ماہر تھے لہٰذا انہوں نے سولہویں صدی تک اٹلی اور ہالینڈ میں اپنی بینکاری کا نظام متعارف کروایا۔ اس علمی انقلاب نے عیسائیوں کی توجہ یہود کی مذہبی سرمائے کی طرف بھی موڑی جس کی بدولت کئی عیسائی یہودی ربیوں کے شاگرد بھی بن گئے ، عیسائیوں کے عقائد اور مذہبی روایات پر یقینا اس تدریس کی فرق پڑا ہوگا کیونکہ ہمیں اس کے بعد عیسائیوں میں بھی کئی ایسے افراد نظر آتے ہیں جنھوں نے یہود پر ہونے والے مظالم کو بری نظر سے ہی دیکھا۔

یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا اثر یہود پر خاص اٹھارہویں صدی میں ہوا جب جرمنی میں موسیٰ مینڈلیسان (1729-1786)، ایرون ہیل(1754-1835) اور جوزف پرل (1773-1839)جیسے مفکر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے لوگوں کو عبرانی روایات کو چھوڑ کر جرمنی زبان اور طرزِ معاشرت اپنانے کی دعوت دی۔ اس تحریک کو تاریخ میں ہسکلہ (Haskalah) تحریک کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ تحریک دراصل سیکولر یہودیت کی بنیاد تھی۔ اس مکتب فکر کے لوگوں نے پرجوش انداز میں اپنا منشاءلوگوں کے سامنے پیش کیا جسے یورپی یہود نے تسلیم کرلیا۔ البتہ اس تحریک کے اثرات سے یہود اپنی قدیم روایات سے کافی دور ہوکر جرمن تہذیب میں مل گئے۔ یہود کا ایک مذہبی طبقہ بھی قائم رہا لیکن امریکہ ، کینیڈا اور یورپ میں اکثر یہود اسی سیکولرازم کے حامی ہوئے۔

اس طرح سے یہود اس دور سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے: ایک روایت پسند یہودی جو کہ آرتھوڈوکس یہودیت (Orthodox

(Judaism) کے قائل تھے۔ دوسرے جدت پسند جو کہ ریفارم یہودیت (Reform Judaism) کہلاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا فرقہ بھی پیدا ہوا جو کہ اعتدال پسند یہودی (Conservative Judaism) کہلائے۔ ان تینوں فرقوں کے بنیادی نظریات یہ ہیں:

- آرتھوڈوکس یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ تورات اور تالمود دونوں ہی اللہ تعالی کی وحی ہیں جو حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام پر نازل ہوئیں۔ یہود کے تمام قوانین، جو کہ ہلاخہ (Halakha) کہلاتے ہیں، پر عمل کرنا ہر یہودی پر لازم ہے۔ ان میں سے بعض یہودی الٹرا آرتھوڈوکس کہلاتے ہیں اور یہ اپنی وضع قطع اور لائف اسٹائل میں مغربی معاشرت سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔
- ریفارم یہودیوں کا کہنا ہے کہ تورات انسانی تحریر ہے، اس لیے اس کے قوانین وقت کے تقاضوں کے تحت تبدیل بھی کیے جا سکتے ہیں اور ہلاخہ پر عمل کرنا ہر یہودی پر لازم نہیں ہے۔ اس طرح سے ریفارم یہودی، مغربی معاشرت سے خود کو ہم آہنگ کر چکے ہیں۔
- کنزرویٹو یہودیوں کے نظریات بقیہ دو کے درمیان میں ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ تورات اللہ تعالی کی وحی ہے مگر انسانی ذرائع سے منتقل ہوئی۔ ہلاخہ پر عمل کرنا ضروری ہے تاہم قانون کو وقت کے تقاضوں کے تحت اجتہاد کر کے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

یورپ کے علاوہ روس اور پولینڈ کے یہودی بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہے، اٹھاہویں صدی کے آخر میں روس میں ہونے والے فسادات کی وجہ سے یہود کو امریکہ اور کینیڈا میں بڑی تعداد میں ہجرت کرنا پڑی، لیکن ان ہجرت کرنے والوں میں سے بعض نے ریفارم تحریک کو درست نہیں سمجھا اور کنزرویٹو یہودیت کو اختیار کر لیا۔

اسرائیل کا قیام

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہود کے خلاف ظاہر ہونے والے سخت رویوں نے یہودی مفکرین کو اس بات کا احساس دلادیا تھا کہ یہود اس وقت تک باعزت زندگی نہیں گزارسکتے جب تک کہ ایک آزاد یہودی ریاست قائم نہ کرلی جائے۔اس ضمن میں تورات مین فلسطین میں ارض موعود اور خدائی حکومت کا تصور بھی موجود تھا، یہودی فلسطین کو ہمیشہ ہی سے اپنا وطن سمجھتے آئے تھے، چنانچہ اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلے محبان صہیونی اور بعد میں1897 میں ایک یہودی ٹوڈور ہرتزل نے سوئیٹزرلینڈ میں صہیونیت (Zionism) کے نام سے منظم تحریک قائم کی۔اس تحریک کا مقصدِ خاص یہ تھا کہ یورپ اور دیگر علاقوں سے یہودی جوق در جوق فلسطین میں آباد ہونا شروع ہوجائیں۔ چنانچہ اس

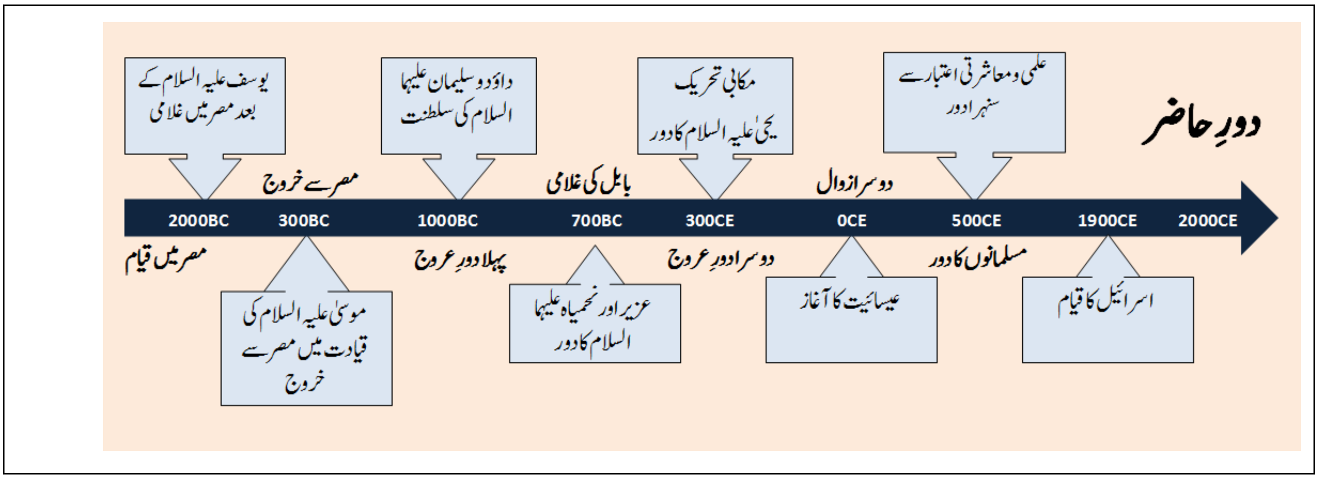
تحریک کے منصوبے کے تحت 1914 تک تقریباً 65,000 یہودی فلسطین میں آباد ہوگئے۔ 1914-1939 کے دوران کثیر تعداد میں یہودی آ آکر فلسطین میں آباد ہوتے رہے اور یہاں کے عربوں سے ان کی زمینیں خریدتے رہے۔

1939 میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جس میں یہودیوں کو ہٹلر کی طرف سے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ضمن میں ہولوکاسٹ کے متعلق بھی یہودیوں کے ہاں یقین کیا جاتا ہے کہ 1939-1945 کے درمیان 304,000 یہود کو آگ سے بھرے چیمبر میں زندہ جلادیا گیا، تاہم اس ہولوکاسٹ کے متعلق مورخین اور ماہرین کو کئی شبہات ہیں، اور کئی ایک وجوہات کی بناءپر اس کا انکار بھی کیا جاتا ہے۔ بہرحال دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد بالآخر 1948 میں دو ہزار سال بعد اسرائیل کی یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا اور فلسطین کو اِسرائیلی ریاست قرار دے دیا گیا۔

اسرائیل کی اس ریاست کے خلاف مقامی عربوں میں شدید تحریک پیدا ہوئی اور انہوں نے 1948 میں ان سے جنگ کی مگر ناکام رہے۔ 1967 میں مصر، شام اور اردن کی مشترکہ افواج نے عرب نیشنل ازم کے جھنڈے تلے متحد ہوکر اسرائیل پر حملہ کیا لیکن اسرائیل نے امریکہ اور یورپی قوتوں کی مدد سے انہیں نہ صرف شکست دی بلکہ ان سبھی ممالک کے بڑے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد 1973 میں ایک اور بڑی جنگ ہوئی جس میں ابتدا میں مصر نے اسرائیل کو شکست دی لیکن امریکہ کی مداخلت کے سبب اسرائیل محفوظ رہا اور امریکی اثرات کے تحت مصر نے اس سے صلح کرلی جس پر اسرائیل نے مصر کو اس کے وہ علاقے واپس کر دیے جو 1967 کی جنگ میں اسے حاصل ہوئے تھے۔ فلسطینی مسلمانوں اور اسرائیل کے مابین گوریلا جنگ جاری ہے اور آج تک یہی صورتحال ہے۔

اسرائیل میں یہودیوں نے ایک مذہبی ریاست کی بجائے سیکولر قومی ریاست قائم کی ہے اور یہاں تورات کی بجائے سیکولر قوانین رائج ہیں۔

یہودیوں کی پوری تاریخ کو ہم اس ٹائم لائن کی شکل میں ظاہر کرسکتے ہیں:



کتب مقدسہ

یہودیوں کی دو مقدس کتابیں ہیں: عہد نامہ قدیم اور تالمود۔

عہد نامہ قدیم (Old Testament)

عہد نامہ قدیم (یا عتیق) موجودہ بائبل کا ایک حصہ ہے۔ اس کے دو نسخے ہیں، ایک عبرانی زبان میں اور دوسرا یونانی زبان میں۔ یہودیوں کے ہاں عبرانی نسخہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ عبرانی بائبل کو تانخ (Tanakh) بھی کہا جاتا ہے۔

عہد نامہ قدیم کا تعلق زمانہ قبل از مسیح سے ہے اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے منسوب کتاب تورات کے علاوہ بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے صحائف شامل ہیں۔ بائبل کا یہ حصہ تخلیق کائنات سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام سے کچھ پہلے تک کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے۔ تورات کے علاوہ بقیہ کتب کی حیثیت بنی اسرائیل کی تاریخ کی ہے۔ عہد نامہ عتیق کو تین سلسلوں میں درجہ بندی کرسکتے ہیں۔ اس درجہ بندی کے مطابق پہلا سلسلہ تورات (Torah) دوسرا سلسلہ نویم (Nevi'im) اور کتوویم (Ketuvim)۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تورات لغوی اعتبار سے یہ لفظ عبرانی زبان کا ہے جس کے معنی وحی یا فرشتہ کے ہیں۔ یہودیت کی اصطلاح میں یہ عہد نامہ عتیق کی وہ پانچ کتابیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے منسوب ہیں۔ یہ کتابیں پیدائش، خروج، احبار، اعداد اور استثناء ہیں۔ ان کتابوں کو کتب خمسہ (Pentateuch) یا قانونِ موسوی (Law of Moses) بھی کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے عام عقیدے کے مطابق یہ پانچوں کتابیں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو طور سینا پر خدا کی طرف سے ملیں۔

گزشتہ صفحات میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ یہودیوں کی مقدس کتابیں کئی بار حملہ آوروں کی وجہ سے ضائع ہوئی تھیں، جسے حضرت عزیر علیہ الصلوۃ السلام نے از سر نو مرتب کیا۔ لیکن انہوں نے تورات کو کس زبان میں مرتب کیا، تاریخ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، نہ ہی ہمارے پاس اس وقت کا اصل نسخہ ہے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ انہوں نے تورات کو ارامی زبان میں لکھا یا عبرانی زبان میں۔ تاہم یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ چونکہ بنی اسرائیل بابل کی اسیری کے زمانے میں اپنی زبان سے رشتہ تقریباً ختم کرچکے تھے اس لیے حضرت نے انہیں آرامی زبان میں مرتب کی ہوں گی۔ موجودہ عبرانی نسخہ دراصل ایک یونانی نسخے کا ترجمہ ہے جو 285BC میں تیار کیا گیا۔ ان کتابوں کی تفصیل یوں ہے۔

1۔ کتاب پیدائش (Genesis): اس کتاب میں تخلیق کائنات اور تخلیق آدم علیہ الصلوۃ السلام سے لے کر حضرت یوسف

علیہ الصلوۃ السلام تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔اس میں نوح علیہ الصلوۃ السلام کی نبوت اور سیلاب، ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام کی نبوت اور خدا کے عہد اور دیگر انبیاء کے قصص ہیں۔

2۔کتاب خروج (Exodus): اس میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام اور بنی اسرائیل کا مصر سے خروج کے متعلق واقعات مذکور ہیں، اللہ تعالی کو اس کتاب میں یہواہ (YHWH) کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ان کے متعلق بھی اس کتاب میں قدرے تفصیل موجود ہے۔

3۔کتاب احبار(Leviticus): اس کتاب کو سفر الاویون بھی کہاجاتا ہے۔یہ حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ السلام کے بیٹے لاوی کی طرف منسوب ہے جو مذہبی فرائض اور تعلیم و تدریس کے ذمہ دار تھے۔اس کتاب میں تاریخ بہت ہی کم بیان کی گئی ہے ، زیادہ تر فقہی احکامات یعنی مذہبی رسوم ، حلال و حرام وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔

4۔کتاب اعداد (Numbers): اس کتاب میں بنی اسرائیل کا صحرائے سینا سے نکل کر اردن کی طرف جانے کا واقعہ مذکور ہے، لیکن اس کتاب کا خاص موضوع بنی اسرائیل کا شجرۂ نسب اور ان کی مردم شماری(Census)ہے۔اس میں بنی اسرائیل کی مختلف شاخوں کی تقسیم اور ہر قبیلے کے افراد کی تعداد وغیرہ مذکور ہیں۔

5۔کتاب استثناء (Deuteronomy): اس کتاب میں دوسری اور تیسری کتاب کے قوانین کا خلاصہ اور مزید تشریحات ہیں، حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے خطبات اور احکام عشرہ بھی اس میں موجود ہیں۔مذہبی قوانین کے اعتبار سے اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔چاروں کتاب کی طرح یہ کتاب بھی مکمل طور پر حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے منسوب ہے تاہم اس میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی وفات اور اس کے بعد کے کچھ واقعات بھی ملتے ہیں۔

6۔نویم(Nevi'im): نویم تاریخ یعنی عبرانی بائبل کا دوسرا حصہ ہے۔اس میں مجموعی طور پر بائیس کتابیں شامل ہیں۔ان میں انبیائے کرام علیہم السلام کے صحائف شامل ہیں۔یہ حصہ میں کتاب یوشع، کتاب یسعیاہ، کتاب یرمیاہ، کتاب سموئیل، حزقی ایل، قضاۃ، سموئیل (اول و دوم) سلاطین (اول و دوم) اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے صحائف پر مشتمل ہے۔چھوٹے غیر معروف اور بڑے پیغمبروں علیہم الصلوۃ والسلام کے صحائف کی مناسبت سے اس کتاب کے مزید دو حصے کرکے بھی فرق کیا جاتا ہے۔

:7 کتوویم(Ketuvim): یہ حصہ بارہ کتابوں پر مشتمل ہے ۔موضوع کے اعتبار سے اس کے بھی تین حصے کیے جاتے ہیں۔پہلے حصے میں حضرت داؤد کی زبور، حضرت سلیمان کی امثال اور حضرت ایوب علیہم الصلوۃ السلام کی مزامیر شامل

ہیں۔دوسرے حصے میں پانچ مجلات ہیں۔یہ غزالغزلات، رعوت، نوحہ یرمیاہ ،الجماعہ اور آستر پر مشتمل ہے۔تیسرا حصہ دانیال، نحمیاہ، تواریخ اول اور دوم پر مشتمل ہے۔

عہدنامہ قدیم کے ان تین سلسلوں کے علاوہ بھی تقریباً 17کتابیں اور بھی تھیں جن کے حوالے عہدنامہ قدیم میں ملتے ہیں لیکن وہ کتابیں اب معدوم ہیں۔

عہدنامہ قدیم کی تدوین و تالیف

موجودہ عہدنامہ قدیم کی تدوین و تالیف کے حوالے سے کوئی بھی تاریخ متفقہ طور پر نہیں بتائی جاسکتی، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کئی مرتبہ غیر حکمرانوں کے عتاب کا شکار ہونا پڑا ہے جس میں ان حکمرانوں نے ہیکل سلیمانی اور کتب مقدسہ کو جلادیا۔یہودی کتب مقدسہ کسی بھی گذشتہ دور میں زیادہ عرصے تک کتابی صورت میں قائم نہیں رہ سکی ہے، بلکہ ان کے مذہبی ادب کا سرمایہ علماءکے حافظوں سے نسلوں تک منتقل ہوتا رہا ہے۔آٹھویں صدی قبل مسیح میں سامریہ کی پہلی تباہی سے لے کر613میں ایران کے شاہ خسرو پرویز تک تقریباً سات مرتبہ یہودیوں کی مقدس کتابوں کو مکمل طور پر ضائع کیا گیا۔یہودی محققین کے مطابق عہدنامہ قدیم کی سب سے آخری تدوین جامنیاکونسل میں کی گئی۔

تلمود یا تالمود (Talmud)

عہدنامہ قدیم کے علاوہ یہودیوں کی ایک اور کتاب مقدس سمجھی جاتی ہے جسے یہود تالمود کا نام دیتے ہیں۔یہ یہودی شریعت کا دوسرا اہم ترین ماخذ ہے جس میں یہود کے مطابق حضرت ہارون علیہ الصلوۃ السلام اور ان کی اولادوں کے اقوال و حالات مذکور ہیں۔مذہبی احکام ہونے کی بناءپر اسے عہدنامہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اسے ہم اپنی زبان میں ”حدیث“ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

یہود کے مطابق کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو جو وحی ملی وہ دو اقسام پر تھیں۔ایک وہ بنیادی قوانین ہیں جو احکام عشرہ کہلاتے ہیں۔یہ احکام اور ان کی تفصیل تختیوں پر کندہ تھے، اسے عام طور پر مکتوب شریعت کہا جاتا ہے۔جب کہ دوسری قسم کی وحی آپ کو الہام ہوئی جسے زبانی شریعت کہا جاتا ہے۔یہودیوں کے مطابق زبانی شریعت کی تعلیم حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون اور حضرت یوشع علیہم الصلوۃ السلام کو دی۔یوشع علیہ الصلوۃ السلام نے بنی اسرائیل کے اہم سرداروں کو یہ خدائی قانون پڑھایا اور اس طرح سینہ بسینہ روایت ہوتے ہوئے یہ قوانین حضرت عزرا علیہ الصلوۃ السلام تک پہنچے۔ان کے بعد کئی نسلوں سے یہ شریعت زبانی روایت ہوتے ہوئے دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے علما(ربی) تک پہنچی اور

انہوں نے 220CE میں اسے مرتب کرکے مشنا(Mishnah)" کا نام دیا۔یہ تالمود کا پہلا حصہ بنا اور اس کے بعد 500CE کے لگ بھگ مشنا کے متن کی جو تشریح کی گئی، اسے "جمارہ (Gemarah)" کا نام دیا گیا۔عام طور پہ تالمود سے مراد یہی دوسرا حصہ لیا جاتا ہے۔

1۔ مشنا: مشناءکے اہم ترین مضامین زراعت، تجارت، عائلی قوانین، تعزیری قوانین، نذر و قربانی، علماءکے متعلق احکام، سیاسی قوانین وغیرہ شامل ہے۔

2۔ جمارہ: جمارہ میں مشناءکے متن کی تشریح کے علاوہ طب، نباتات فلکیات، جیومیٹری اور اس قسم کے دوسرے مضامین شامل ہیں۔

تالمود کی دوروایتیں موجود ہیں، ایک عراقی اور دوسرا فلسطینی۔ عراقی روایت کو بابلی تالمود (Babylonian Talmud) جبکہ فلسطینی کو یروشلمی تالمود (Talmud Yerushalmi) کہا جاتاہے۔ان دونوں کی زبان رومی ہے۔یروشلمی تالمود، بابلی تالمود سے حجم میں تین گنا بڑاہے۔اس میں مذہبی احکامات کی تفصیلات زیادہ ہیں۔

عقائد

یہودی عقائد کی بنیاد خدا کی وحدانیت اور بنی اسرائیل کی فضیلت ہے۔ [1]

تصور خدا

یہودی توحید پر سختی سے یقین رکھتے ہیں اوریہ یہودیت کا سب سے اہم اصول ہے۔توحید سے مراد خدا کو ایک ماننا ہے۔حضرت ابراہیم لے کر حضرت یعقوب علیہاالصلوۃالسلام کے زمانے تک یہود خدا کے لیے الشدائی کا لفظ استعمال کرتے تھے، لیکن بعد میں یہی نام یہوواہ (YHWH)سے بدل دیا گیا۔یہود خدا کو یہوواہ کے نام سے پکارتے ہیں، لیکن اس لفظ کے صحیح تلفظ کے بارے میں مورخین کے مابین اختلاف ہے۔بعض اسے یَہو کہتے ہیں اور بعض اسے یَہوِوہ، یَہَوِ اور دیگر تلفظ سے مانتے ہیں۔ تلفظ کے اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ یہود کے مطابق انہیں خدا کا خاص نام لینے کی قطعی اجازت نہ تھی کیونکہ وہ اس میں خدا کی بے ادبی سمجھتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی ہےچونکہ عربی اور اردو کی طرح عبرانی میں بھی حرکات

---

[1] یہ عقائد اس کتاب سے ماخوذ ہیں:

Louis Jacobs.The Book of Jewish Belief. USA: Behrman House, Inc, (1984)

نہیں لکھی جاتیں، اس لیے تلفظ میں فرق پڑ گیا۔

بنی اسرائیل کی فضیلت کا عقیدہ(Chosen People)

یہودی عقائد کے مطابق بنی اسرائیل خدا کے منتخب کردہ بندے ہیں اس لیے انہیں دیگر اقوام پر فضیلت حاصل ہے۔ یہودیوں کے مطابق اس فضیلت سے مراد کوئی نسلی امتیار یا افتخار نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں دنیا کی رہنمائی اور قیادت کے لیے منتخب کیا ہے اور کیونکہ (یہودی عقائد کے مطابق) نبوت صرف بنی اسرائیل میں ہی آتی ہے اور چونکہ یہودی پیغمبروں کی اولاد ہے اس لیے وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

دیگر عقائد

ان دو عقائد کے علاوہ وضاحت کے ساتھ یہودی عالم موسیٰ بن میمون نے مشنا کی تفسیر میں دسویں باب میں یہودی عقائد کی تفصیل تیرہ نکات میں یوں دی ہے۔

- وجود خداوندی پر ایمان
- خدا کی وحدت پر ایمان
- خدا کے دائم ہونے پر ایمان
- خدا کے غیر مادی ہونے پر ایمان
- عبادت کے لائق صرف ایک خدا ہی ہے۔
- پیغمبروں پر ایمان
- حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے سب سے برگزیدہ پیغمبر ہونے پر ایمان
- تورات (زبانی و تحریری) موسی علیہ الصلوۃ السلام کو کوہِ سینا پر عطا کی گئی
- تورات نا قابل تغیر ہے
- خدا علیم و خبیر ہے
- یوم آخرت، سزا و جزا اور حیات بعد الموت پر ایمان
- مستقبل میں آنے والے نجات دہندہ مسیح پر ایمان
- مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان

نجات (Salvation) کا تصور

نجات کا متعلق یہودیت میں وہ تصور نہیں ہے جو دیگر مذاہب میں ہے۔یہودیت کے ہاں نجات سے مراد اسی دنیا میں نجات دہندہ مسیح کی آمد کے بعد عدل کا قیام ہے۔اس دور کو (Messianic Age) تاہم جنت و دوزخ کا تصور ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔

عبادات و رسوم

یہودیوں کے ہاں متعدد عبادات اور مذہبی رسوم موجود ہیں جن کی تفصیل ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

ایک سائناگاگ



www.flickr.com (13 Feb 2013)

ٹیفیلاہ

روزانہ کی جانے والی یہودی عبادت کو ٹیفیلاہ (Tefilláh) کہتے ہیں البتہ اردو اور فارسی میں عام طور پر اسے یہودی نماز بھی کہاجاتا ہے۔یہودی دن میں تین مرتبہ صبح صادق کے وقت، دوپہر اور شام کے وقت غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے یہ نماز ادا کرتے ہیں۔پہلی نماز شاخریت (Shacharit)، دوسری نماز منخا (Mincha) اور تیسری نماز آروِت (Arvit) اور مارِو (Ma'ariv) کہلاتی ہے۔

راسخ العقیدہ یہودیوں کے ہاں اس عبادت کی ادائیگی سے قبل دونوں ہاتھ ضروری سمجھا جاتا ہے۔جبکہ دیگر فرقوں کے ہاں صبح ہاتھ، پاؤں

اور منہ دھولیناعبادت کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ٹیفیلاہ عام طور پر مخصوص انداز میں عملی طور ادا کی جاتی ہے اور تورات کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہودی عبادات کی تفصیل کتاب سدّور(Siddur) میں موجود ہے جو خاص احکام عبادات پر مشتمل ہے۔یہ کتاب یہودی عالم امرم گون(d. 875) نے مرتب کی تھی۔

عبادت گاہ

یہودیوں کی عبادت گاہ سیناگاگ Synagogue)'' کہلاتی ہے۔یہودیوں کے ہاں اس عبادت گاہ میں جانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں ، پہلے سر پر ٹوپی پہن کر جانا ضروری ہوتا تھا، تاہم عصر حاضر میں اس حکم کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔

سائناگاگ کااندرونی منظر



http://es.globalvoicesonline.org(13 Feb 2013)

تہوار

یہودیوں کے ہاں مختلف قسم کی رسوم اور تہوار ہیں جنھیں یہودی بہت اہتمام سے مناتے ہیں۔یہ تہوار یہودی (عبرانی) کیلنڈر کے مطابق منائے جاتے ہیں۔ان تہواروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، ذیل میں ہم یہودیوں کے اہم تہواروں کا تعارف دیں گے۔

1۔یوم السبت(Sabbath Day): یہودیوں کے ہاں ہفتہ کے دن کی تعطیل بہت اہم خیال کی جاتی ہے۔اس دن کو یوم

السبت کہا جاتا ہے۔سبت کا حکم موسوی شریعت کے اہم ترین حصہ احکام عشرہ میں موجود ہے۔اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ خداوند نے کائنات کرتے ہوئے ساتویں دن آرام کے لیے مختص کیا تھا، اسی لیے اس دن کام کاج نہیں کرنا چاہیے۔سبت جمعہ کے دن غروب آفتاب سے ہفتہ کے دن ستاروں کے نظر آنے تک رہتا ہے۔اس دن یہودی ایک جشن مناتے ہیں جس میں سبھی کی شرکت ضروری ہوتی ہے ، اسی لیے اس دن عام تعطیل کی جاتی ہے اور راسخ العقیدہ یہود سارے دن عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔

2۔عید الفصح (Passover): یہ یہودیوں کا ایک اہم تہوار ہے جو آٹھ دن چلتا ہے۔اس تہوار کو پیساخ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تہوار بنی اسرائیل کی مصر سے آزادی کی یادگار میں یہودی کیلنڈر کے مطابق بہار کے موسم میں منایا جاتا ہے۔عام طور پر اس تہوار کے دنوں خاص ایسی اشیاء مثلاً تلخ سبزیاں، بغیر خمیر کے روٹی وغیرہ پکائی جاتیں ہیں جن سے سفر کی یاد تازہ ہو جائے۔

3۔پینٹی کوسٹ (Pentecost): یہ تہوار عید فصح سے پچاس دن گزرنے کے بعد منایا جاتا ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو کوہِ سینا پر مقدس تختیاں ملنے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔اس تہوار کے موقع پر یہودی راہب دودھ سے بنی گندم کی دو خمیری روٹیاں پکواتے ہیں، پھر سات بھیڑیں، یا ایک بیل یا دو دنبے ذبح کرتے ہیں جس سے غریب مستحقین کی دعوت کی جاتی ہے۔عبادت گاہوں میں اس روز خاص عبادات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

4۔روش ہاشاناہ (Rosh Hashanah): یہ یہودی کیلنڈر کے سال کی ابتداء کا دن ہے جو عیسوی کیلنڈر کے حساب سے ستمبر یا اکتوبر میں آتا ہے۔یہودی کیلنڈر کا آغاز یہودی عقائد کے مطابق آدم و حوا علیہما السلام کے زمین پر آنے کے ساتھ ہوتا ہے۔اسی کی یاد میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔

5۔یوم کپور (Yom Kippur - the Day of Atonement): یہ یہودی کیلنڈر کے پہلے ماہ کے دسویں دن بطور عشرہ توبہ منایا جاتا ہے۔اس تہوار کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تورات کی کتاب احبار کا پورا سولہواں باب اس دن کے متعلق احکامات پر مشتمل ہے۔اس تہوار کا مقصد سال بھر کی توبہ کرنا ہوتا ہے۔اس میں باجماعت خدا سے معافی مانگتے ہیں، آئندہ سال میں نیکیاں کرنے اور گناہ سے پرہیز کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔اس دن روزہ رکھا جاتا ہے اور ازدواجی تعلقات سے پرہیز کیا جاتا ہے۔عام طور پر دن کا زیادہ تر حصہ عبادت میں گزرتا ہے۔

6۔سکّوت (Sukkah): یہ تہوار ایک ہفتہ رہتا ہے، جو صحرائے سینا میں دربدر پھرنے کی یاد دلاتا ہے۔اس تہوار کے

دوران یہود خاص قاعدوں کا خیال رکھتے ہوئے خیمے بناکر ان میں رہتے ہیں۔

7۔پوریم (Purim): یہ تہوار یہود ی کیلنڈر کے چھٹے ماہ ادر کی چودھویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔عیسوی کیلنڈر میں یہ دن فروری اور مارچ کے درمیان آتا ہے۔یہ تہوار یہودی قوم ہامان کے حملے سے بچ نکلنے کی خوشی میں مناتی ہے۔

یہودی فرقے

دیگر مذاہب کی طرح یہودیت میں بھی بہت سے فرقے ہیں، لیکن چونکہ یہود کی تعداد بہت کم ہے اس لیے ان میں کئی فرقے خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ذیل میں یہودیوں کے اہم فرقوں کا تعارف دیا جارہا ہے۔

سامریہ *(Samaritans)*

سامریہ یہودیوں کا ایک چھوٹا سا فرقہ ہے، جس کی تعداد اس وقت اندازاً تین سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔لیکن یہ یہودیوں کا سب سے قدیم فرقہ خیال کیا جاتا ہے۔اس فرقے کے اکابر وہ لوگ ہیں جو عراقی آشوریوں کے حملے کے بعد فلسطین میں رہ گئے تھے۔انہوں نے یہاں بت پرستی شروع کردی تھی، یہودیوں نے یروشلم کی واپسی کے بعد انہیں یہودی ماننے سے انکار کردیا تو یہ دونوں کے مابین خانہ جنگی شروع ہوگئی اور بالآخر چھٹی صدی عیسوی میں اس فرقے کو زوال ہوگیا۔اس فرقے کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس تورات کا قدیم ترین نسخہ ہے۔ان کے پاس بائبل دیگر نسخوں سے کافی مختلف ہے۔

قاراازم *(Karaite / Karaism)*

یہودیوں کے ہاں تالمود عہد نامہ نامہ عتیق کے بعد سب سے اہم کتاب ہے، عام طور پر سبھی یہود اسے مقدس تسلیم کرتے ہیں ، لیکن اس کے باوجود بغدار اور مصر میں ایک چھوٹا سا مکتب فکر ایسا بھی رہا جس نے اس کتاب کی اہمیت ماننے سے انکار کردیا۔ تاریخ میں اگرچہ اس کا وجود پہلی صدی قبل مسیح میں ملتا ہے ؛ لیکن اسے باقاعدہ طور پر منظم کرنے میں اہم کردار آٹھویں صدی عیسوی میں احنان بن داؤد کا ہے۔یہ فرقہ قاراازم کہلاتا ہے۔قاراازم سے تعلق رکھنے والے یہود اپنے مذہبی قوانین کا ماخذ صرف عہد نامہ عتیق کو قرار دیتے ہیں۔احنان بن داؤد نے یروشلم کو اپنا تبلیغی مرکز بنایا اور اپنے مسلک کی تعلیمات عام کیں۔چودھویں صدی عیسوی تک اس فرقے کے پیروکاروں کی تعداد اچھی خاصی ہوچکی تھی لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ ان کا اثر کم ہوتا گیا۔اس وقت ایشیاءکے بعض علاقوں میں اس فرقے کے

لوگ پائے جاتے ہیں۔

قوانین کے ماخذ کے علاوہ اس فرقے کے لوگ بعض دیگر امور میں بھی عام یہودیوں سے منفرد ہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے متعلق ان کے عقائد باقی یہودیوں سے قدرے مختلف ہیں۔یہ حضرت عیسی ایک نیک اور متقی بزرگ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی بعثت شریعت موسوی کے احیاءکے لیے تھی۔اس کے علاوہ یہ فرقہ اکثر یہودی رسوم کو نہیں اپناتا ان کا طرزِ زندگی باقی یہودیوں سے کافی مختلف ہے۔

راسخ العقیدہ یہودی (Orthodox Judaism)

آرتھوڈکس یہودیت دراصل یہودیوں کی قدیم تہذیب کے علمبردار ہیں۔یہ تورات اور تالمود دونوں کو مقدس تسلیم کرتے ہیں۔اس فرقے کے لوگ یہودیوں کے ہاں فقہاء، راہب، زاہد اور قاضی کے طور پر پہچانے جاتے ہیں ، یہ لوگ حیات بعد الموت ، جزا و سزا اور جنت و جہنم کے بھی قائل ہیں۔اس فرقے سے تعلق رکھنے والے یہودی عام طور پر اپنی علیحدہ بستیاں بناکر رہتے ہیں۔یہ لوگ قبالہ سے منسلک ہیں اور عبرانی کے حروف ابجد (Alphabets) میں جادوئی اثرات پر بھی یقین رکھتے ہیں۔اس فرقے میں بھی کئی ذیلی مکاتب فکر موجود ہیں۔

ریفارمسٹ یہودی(Reform Judaism)

یہودیت میں جدت پسندی کی تحریک جرمنی میں اٹھارہویں صدی میں شروع ہوئی جسے برطانیہ میں قبولیت عام حاصل ہوئی۔روایت پسند یہودیوں کے برعکس ریفارم یہودیوں نے یہودی شریعت کو جدید تہذیب کے عین مطابق بنانے کے لیے اس میں کئی معنوی تبدیلیاں کیں اور یہودی قوانین کی نئی تشریحات پیش کیں۔مذہبی کتابوں کے متعلق اس مکتب فکر کا ماننا ہے کہ تورات خدائی تعلیمات ہیں لیکن اسے انسانوں نے اپنی زبان اور اپنے انداز میں لکھا ہے۔روایت پسندوں کے برعکس ریفارم یہودی سیکولر خیالات کے حامی ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ یہودیت کسی ایک قوم یا خطے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک عالمی مذہب ہے جس میں ہر ایک تہذیب و تمدن کی گنجائش موجود ہے، لہٰذا جدید تہذیب اپنانے میں کوئی برائی نہیں ہے۔یہ مذہبی رسومات سے زیادہ معاشرتی رویے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔روایت پسندوں کے ہاں مرد اور عورتوں کے متعلق بعض معاملات میں حقوق کا فرق موجود ہے، جبکہ ریفارم یہودی ہر قسم کے معاملات میں مساوی حقوق کے قائل ہیں۔

کنزرویٹویہودی(Conservative Judaism)

سترہویں صدی میں یہودیوں کے ہاں قدامت پسندی اور جدت پسندی کا رجحان فروغ پارہا تھا۔ ایک طرف جرمنی یہودی مفکرین کی جانب سے جدت پسندی کی بناپر یہودی شریعت میں کئی تبدیلیاں کی گئیں، دوسری طرف قدامت پسند مکتب کی طرف سے شریعت کے ظاہری معنوں پر سختی سے عمل کرنے اور اجتہاد کو ممنوع سمجھنے کی وجہ سے یہودی شریعت بے جان ہورہی تھی۔ ان دونوں کے رد عمل میں اعتدال پسندی کا حامی ایک مکتب فکر کا ظہور ہوا جس کے بانی و رہبر اس دور کے بڑے ربی زیشریاس فرینکل (Zecharias Frankel 1801–1875) تھے۔ جدت پسندی کے متعلق اگرچہ انہیں بعض معاملات میں دیگر رہنماؤں سے اختلاف تھا لیکن ایک عرصے تک ریفارم تحریک کے اہم رکن رہے۔ 1845 میں جب ریفارم جدت پسندوں کی طرف سے یہودی عبادات میں عبرانی زبان کا رواج ختم کردیا گیا تو زیشریاس نے اس بارے میں خفگی کا اظہار کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کرلی اور اعتدال پسندی کی تحریک شروع کی۔ یہ تحریک جلد ہی یہودی عوام میں مقبول ہوئی۔ انیسویں صدی میں ایک یہودی ربی (Solomon Schechter 1847-1915) نے امریکہ میں United Synagogue of Conservative Judaism (USCJ) کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے امریکہ میں اس مکتب فکر کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

کنزرویٹویہودی روایت پسند اور جدت پسند میں درمیانی (معتدل) نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ ان کے ہاں قدیم یہودی روایات کا تقدس اب بھی اسی طرح موجود ہے لیکن یہ لوگ ظاہر پرستی اور اجتہاد کے قائم ہیں۔ ان کے نزدیک تورات اور دیگر یہودی قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے تاہم قانون کو وقت کے تقاضوں کے تحت اجتہاد کرکے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ 1988 میں Leadership Council of Conservative Judaism نے اپنے عقائد کے متعلق ایک (آفیشل) کتابچہ شایع کیا۔ اس کتابچے کے مطابق کنزرویٹو کے بنیادی عقائد اعتدال کا مظہر ہیں۔ توحید کے علاوہ کنزرویٹو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یہودیت ایک مذہب سے بڑھ کر ایک مکمل تہذیب کا نام ہے جس میں طرزِ حیات، لباس، زبان، فنون لطیفہ اور ایک مقدس سرزمین "اسرائیل" سے محبت شامل ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی طرف سے اہل زمین کے لیے رہبر (A light unto the nations) کی حیثیت سے مقرر ہیں چنانچہ یہ یہود کا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا کی قیادت کریں۔ ان کے مطابق تورات وحیٔ الٰہی ہے لیکن یہ ہم تک انسانی ذرائع سے منتقل ہوئی ہے اور اس میں انسانی اثرات شامل ہوگئے ہیں۔ ان کے نزدیک ہلاخہ یعنی تورات کے قانون پر عمل کرنا ضروری ہے البتہ وقت کی ضروریات کے مطابق ان قانون میں اجتہاد کرکے تبدیل کرنا ضروری ہے۔ یہ اجتہاد ایک خاص دائرہ کار میں رہتے ہوئے

تورات کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ہونا چاہیے جس سے یہودی شریعت کی روح متاثر نہ ہو۔[1]

یہودی تصوف: قبالہ

یہودیوں کے تصوف کو قبالہ کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد تورات کا باطنی علم ہے جو یہودیوں کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے نسل در نسل زبانی منتقل ہوتا رہا۔ یہودیوں میں اس کی روایت کافی پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے ہی جادو ٹونہ وغیرہ کا رواج تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کو شکست دینے کا واقعہ بھی اس طرف وضاحت کرتا ہے اس علم کے بڑے بڑے ماہر اُس دور میں موجود تھے۔ آگے چل کر یہ سلسلہ وسعت پذیر ہو گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں اس علم کو فروغ ہوا اور یہودیوں کو دلچسپی اس شعبہ میں حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ قبالہ کے علم کو حضرت سلیمان ں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور آج بھی ان کے ہاں تعویز گنڈے وغیرہ پر نقش سلیمانی کندہ ہوتا ہے۔

قبالہ کو باقاعدہ طور پر بارہویں ویں صدی میں جنوبی فرانس اور سپین میں منظم کیا گیا تھا۔ سپین سے یہودیوں کی جلاوطنی کے بعد یہ رجحان ترکی اور فلسطین یہودی آبادی کے ساتھ وہاں منتقل ہوا۔ موجودہ قبالہ میں علم الاعداد، علم نجوم، تعویذ اور اس قسم کے دیگر علوم شامل ہیں۔ ان علوم میں سے اہم علم الاعداد کا تھا۔ علم الاعداد یہود نے اپنی عبرانی زبان کے حروف تہجی (ALPHABET) کے ساتھ کچھ قیمت (Values) مقرر کر دی اور ان میں روحانیت کا تصور منسلک کر دیا۔ یہ عبرانی الفاظ اور ان کی Values ہمارے ہاں بھی حروف ابجد کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ اس طرح یہود کے ہاں پوری تورات کو اس عددی قیمت میں تبدیل کر لیا گیا اور اس سے منسلکہ روحانی تصورات کی بناء پر تورات کی باطنی علوم پر مبنی تشریح کی۔

اسائن منٹس

1. یہودیت کی تاریخ کے کن واقعات کو آپ اہم مائل اسٹونز کہہ سکتے ہیں؟
2. قبالہ کے نظام کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑا؟
3. حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام کی یہودیت میں کیا اہمیت ہے؟
4. یہودیوں کی اہم عبادات کون سی ہیں؟

[1] EMET VE'EMUNAH (Statement of principles of conservative Judaism) Jewish Theological Seminary of America (1988)

باب 2: عیسائیت

مذاہب عالم میں عیسائیت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ موجودہ دور میں سیاسی و معاشی طور پر سب سے زیادہ مستحکم مذہب نظر آتا ہے۔ دنیا کی تیس فیصد آبادی اس مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس اعتبار سے یہ مذہب بلحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ یہودیت اور اسلام کی طرح عیسائیت بھی درحقیقت ابراہیمی مذاہب کی ہی ایک شاخ ہے جس کے ماننے والے عیسائی اور مسیحی کہلاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کو صحیح طرح سمجھنے کے ضروری ہے کہ ہم نے یہودی مذہب اور اس کے پیروؤں کا صحیح مطالعہ کیا ہو۔ اس مذہب کی عمومی تعریف (Definition) میں عیسائی علماء کے مطابق کہ عیسائیت وہ مذہب ہے جس کا محور یسوع مسیح (علیہ الصلوۃ السلام) ہیں۔ یہ مذہب حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی پیدائش، ان کی زندگی، ان سے منسوب تعلیمات اور ان کی وفات سے متعلق ہے۔ تثلیث اور کفارہ کو اس مذہب میں بنیادی عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے اور ان کا اقرار کیے جانے پر ہی کسی شخص کو عیسائی دنیا میں بحیثیت عیسائی قبول کیا جاتا ہے۔ یہ دین چوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے منسوب ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان کے حالات زندگی کا بھی سرسری مطالعہ کر لیا جائے کہ یہیں سے عیسائیت کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔

تاریخ

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کا نام یشوع، عبرانی میں یسوع اور عربی میں عیسیٰ تھا۔ یسوع کے مبارک اور نجات ہندہ کے ہیں۔ یہی لفظ یونانی، لاطینی زبانوں میں Jesus بنتا ہے۔ آپ اپنے نام کے علاوہ مسیح کے لقب سے بھی مشہور ہیں جس کے معنی کسی چیز پر ہاتھ پھیرنا اور اس سے برا اثر دور کرنا ہے۔ عام معنوں میں اس سے مراد بیماری دور کرنا ہے، انگریزی میں اسی کو Christ کہتے ہیں۔ آپ کو یسوع ناصری بھی کہا جاتا ہے کیونکہ آپ کی رہائش فلسطین کے شہر ناصرہ(Nazareth) میں تھی۔ آپ کی کنیت ابن مریم تھی۔ عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق جناب یسوع مسیح علیہ الصلوۃ السلام کا ایک نام عمانویل (Emmanuel) ہے جس کے معنی ہیں: خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس نام کا ذکر ہمیں بائبل[1] میں بھی بطور پیش گوئی ملتا ہے۔

[1] یسعیاہ 41:7

دورِ مسیح میں یہود کی حالت زار

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی آمد سے قبل یہود دین موسوی میں تحریف کر چکے تھے، یہ لوگ کئی فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ کئی سزا وجزا پر ایمان نہیں رکھتا تھا، کوئی راہبانہ طرزِ زندگی کو درست سمجھتا تھا تو کوئی صرف بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے کو ہی نجات کا ضامن سمجھتا تھا۔ وہ علمائے یہود جو ہیکل (عبادت گاہ) میں مذہبی رسوم انجام دیتے تھے، ان کی حالت بھی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب کو کاروبار کا ذریعہ بنالیا تھا۔ یہ لوگ آسمانی کتاب تورات پر اپنے اجتہادات کو فوقیت دیتے تھے اور تورات کے احکام میں اغراض نفسانی کی تکمیل کے لیے تحریف کرتے رہتے تھے۔ سود، لالچ، حسد جیسی عادات ان میں عام تھیں، ان کے نزدیک دین صرف ظواہر پرستی تھا اور قانون الٰہی کو مسخ کرنے کے لیے وہ ہر موقع پر تیار رہتے تھے۔ اس دور میں یہودی ایک مسیحا (Promised Messiah) کا انتظار کر رہے تھے، جس کی پیشین گوئیاں ان کی مقدس کتابوں میں موجود تھیں۔ لیکن وہ اس کے متعلق صحیح طور پر یہ نہیں جانتے تھے وہ مسیحا کب پیدا ہو گا۔ چنانچہ اب تک اہل یہود مسیحا کے منتظر ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام (Jesus)

مورخین کے مطابق یسوع مسیح علیہ الصلوۃ السلام فلسطین کے شمال میں واقع جھیل گلیلی (Galilee) کے قریب ایک قصبے "ناصرہ (Nazareth)" سے تعلق رکھتے تھے، البتہ ان کی پیدائش وسطی فلسطین کے شہر "بیت لحم" میں ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے، تاہم یہ معلوم ہے کہ ان کی پیدائش کا دورے سے ۴ قبل مسیح کے درمیان ہے۔ ان کی ولادت کنواری حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہوئی۔ اسی بناء پر وہ عیسائیوں کے نزدیک ایک عام انسان کے بجائے خدا کے بیٹے اور بعض عیسائیوں کے نزدیک خود مطلقاً خدا کہلاتے ہیں جو انسان کے روپ میں زمین پر اترا۔ عیسائیت کی مقدس کتاب انجیل متی کے ابتدائی حصے میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی پیدائش کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جب ان کی والدہ مریم کی منگنی یوسف نامی شخص سے ہوئی، تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے ہی وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہو گئی، یوسف نے انہیں بدنام نہیں کرنا چاہا اس لیے انہیں چپکے سے چھوڑ دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے بچپن اور جوانی کے حالات انجیلوں میں بہت ہی کم بیان ہوئے ہیں۔ معمول کی تعلیم اور مذہبی عبادات وغیرہ انہوں نے گھر پر ہی سیکھے، اس دوران وہ سبت (مقدس دن) کی مجالس میں بھی برابر شریک ہوتے رہے۔ ان کی جوانی کا عہد کہاں اور کس طرح گزرا اس بارے میں مورخین کوئی حتمی رائے نہیں دے سکے ہیں۔ تاریخ اس معاملے میں خاموش ہے۔ سیدنا مسیح علیہ الصلوۃ السلام کا یہ دور Lost years of Jesus کہلاتا ہے، مورخین و محققین اس کے متعلق کئی نظریے پیش کرتے ہیں۔ اس

وقت کے مذہبی رہنماء کے برعکس وہ مذہبی تعلیمات نہایت عام فہم انداز میں بیان فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو بیت القدس میں ہونے والی یہودیوں کی بداعمالیوں کے متعلق شدید فکر لاحق تھی اور اکثر آپ ان پر تنقید کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے ان کرپٹ مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا کہ: تم خدا کے حکم کو ترک کرکے آدمیوں کی روایت کو قائم رکھتے ہو؟ اپنی روایات کو ماننے کے لیے خدا کے حکم کو کیا خوب باطل کرتے ہو۔[1] بہرحال تقریباً تیس برس کی عمر میں آپ پر وحی کا نزول شروع ہوا اور آپ کی پیغمبری کا آغاز ہوا۔ خدا نے آپ کو کئی معجزات بھی دیے تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ آپ قریب المرگ بیمار لوگوں کو صحت مند کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب مسیح پڑا۔

ناصرہ، گلیلی



www.ddtravel-acc.com

خدا کا حکم ملتے ہی حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ یہ مذہب کوئی نیا نہیں بلکہ دین موسوی کی ہی اصل روح تھی جسے علمائے یہود نے مسخ کر دیا تھا۔ علمائے یہود پر تنقید کی وجہ سے آپ کو یہودیوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تو آپ گلیلی جھیل کے کنارے واقع کفرنحوم (Capernum) نامی قصبے میں چلے گئے۔ اس قصبے کی اکثریت نے آپ کو مسیح موعود مان کر آپ

[1] انجیل مرقس 9-7:8

پر ایمان لائے۔ یہاں آپ نے پہاڑی پر ایک بڑے مجمع سے خطاب کیا اور اپنی تمام تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا، یہ خطبہ پہاڑی کا خطبہ کے نام سے مشہور ہے۔ عیسائیت میں اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جو بدھ مت میں بنارس کے اپدیش اور اسلام میں خطبہ حجۃ الوداع کی ہے۔ اس وعظ کے چند ابتدائی اقتباسات یہ ہیں:

> مبارک ہیں وہ لوگ جو دل کے غریب ہیں۔ کیونکہ آسمانی بادشاہت ان ہی کے لئے ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ ہے جو غم زدہ ہیں کیونکہ خدا کی طرف سے تسلّی ملے گی۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو حلیم ہیں ۔ کیونکہ وہ خدا کے وعدے سے زمین کے وارث ہوں گے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو راستباز بھوکے اور پیاسے ہیں۔ کیونکہ خدا ان کو آسودہ اور خوشحال کرے گا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو رحم دل ہیں۔ کیونکہ ان پر رحم کیے جائیں گے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو پاک ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو صلح کراتے ہیں۔ وہ تو خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو راستبازی کرنے کے سبب سے ستائے گئے کیوں کہ آسمانی بادشاہت ان ہی کے لیے ہو گی۔ لوگ میری پیروی کرنے کی وجہ سے تمہارا مذاق اُڑائیں گے اور ظلم و زیادتی کریں گے اور تم پر غلط اور جھوٹی باتوں کے الزام لگائیں گے ، تو تم قابل مبارک باد ہو گے۔ خوشی کرنا اور شادماں ہونا اس لیے کہ جنت میں تم اس کا بڑا بدلہ پاؤ گے۔ کیونکہ تم سے پہلے گزرے ہوئے نبیوں کے ساتھ بھی لوگ ایسا ہی سلوک کیا کرتے تھے۔[1]

دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں بارہ افراد حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کے خاص شاگردوں میں شامل ہوئے جنھیں حواری (Apostle) کہا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی تعلیمات میں آپ نے اس بات پر زور دیا کہ اہل یہود اپنی بد اخلاقیاں چھوڑ کر خدا کی راہ اختیار کریں۔ ان کی تعلیمات کا محور محبت تھا۔ سود، شراب، اور حراکاریوں سے آپ نے لوگوں کو روکا اور آسمانی بادشاہت یعنی خدا کے نظام کے قیام کی پیش گوئی کی۔ بعد ازاں اس دعوت سے یہودی علماء خائف ہوئے اور ان کی بھرپور مخالفت کی۔ انجیل[2] کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام پر دو اہم الزامات تھے۔

- آپ یروشلم کی تباہی کے لیے بد دعائیں کرتے ہیں۔
- آپ حضرت داؤد علیہ الصلوۃ السلام کے تخت کے وارث مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

عید فصیح کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یروشلم تشریف لائے اور یہاں انہیں یہودیوں نے گرفتار کر لیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو کاہنوں کے سردار کے سامنے مناظرے کے لیے بھی پیش کیا گیا لیکن وہاں موجود یہودی علماء نے ان کی باتوں پر کفر کا حکم لگا کر واجب القتل قرار دیا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق یہودیوں نے انہیں صلیب پر (عیسائی

[1] انجیل متی۔ باب 5
[2] انجیل مرقس۔ باب 14

عقیدے کے مطابق) قتل کر دیا۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق یسوع اپنے مصلوب ہونے کے بعد تیسرے روز دوبارہ زندہ ہو گئے اور آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ عظیم قربانی انہوں نے نسل انسانی کو اولین گناہ سے پاک کرنے کے لیے دی تھی جو حضرت آدم و حوا سے سرزد ہوا تھا اور ہر انسان اس کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسی بناء پر انہیں نجات دہندہ (Savior) بھی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا نقطہ نظر مختلف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام کی توبہ قبول کر لی تھی اور وہ اس لغزش سے پاک ہو گئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کو سولی پر نہیں چڑھا گیا بلکہ انہیں پہلے ہی آسمان پر اٹھا لیا گیا اور ان کی جگہ سولی اس شخص کو ملی جس نے آپ کی مخبری کی تھی۔ جہاں تک اولین گناہ کا تعلق ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ بہت پہلے حضرت آدم و حوا کی توبہ قبول کر چکے تھے اور اس کا کوئی بوجھ کسی انسان پر نہیں ہے۔

عیسائیت کی اولین شخصیات

جن لوگوں کو عیسائیت کے اولین دور میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، وہ یہ ہیں:

پطرس یا پیٹر

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے شاگردوں میں جناب پطرس کو خاص اہمیت حاصل ہے، یہ ایک فلسطینی یہودی تھے جن کا اصلی نام شمعون (Simon) تھا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام انہیں سیپاس (Sepas) کہہ کر پکارتے تھے، جس کے معنی چٹان کے ہیں۔ پیٹر یونانی زبان میں اسی لفظ کا ترجمہ ہے۔ عیسائیوں کے مطابق یہ ایک صاحب کرامات شخص تھے، جس کی وجہ سے بے شمار لوگوں سے عیسائیت قبول کی۔ انجیل مرقس انہی کے شاگردِ خاص مرقس (Mark) نے تقریباً 70CE میں انہی کی سماعی روایات کی مدد سے مرتب کی تھی۔

ساؤل یا پال

ساؤل اصل میں ایشیا کوچک کے مقام طرطوس کے ایک یہودی باشندے تھے۔ انہوں نے تورات اور دیگر مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے دور میں اگرچہ یہ زندہ تھے لیکن ان کی ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے نہیں ہو سکی۔ شروع میں ساؤل نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی تکذیب کی، کئی عیسائیوں کے قتل بھی کیے لیکن ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کا ان پر ظہور ہوا اور انہوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ اس کے بعد عیسائیت کی تبلیغ میں ساؤل نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تمام یورپ کو عیسائی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

برناباس

برناباس حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے خاص حواریوں میں سے تھے۔ان کا اصل نام انجیلِ لوقا (اعمال: ۴: ۶۳، ۷۳) کے مطابق یوسف تھا۔ برناباس ان کا لقب تھا جو کہ حواریوں نے ان کی لیاقت، خلوص اور فہم کی وجہ سے دیا تھا۔ برناباس کا لفظی ترجمہ تسکین یا نصیحت کا بیٹا ہے۔ جب ساؤل نے عیسائیت قبول کی تو دوسرے حواریوں کو ان کے ایمان کے متعلق انہی نے یقین کرایا تھا۔ یہ ساؤل پال کے ساتھ اکثر تبلیغی دوروں پر جایا کرتے تھے۔ ان کی طرف بھی ایک انجیل انجیلِ برناباس منسوب ہے۔ البتہ بائبل کے مطابق بعد ازاں پال اور برناباس کے درمیان اختلاف ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے علیحدہ اختیار کرلی۔ اس اختلاف کے بارے میں بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ برناباس یوحنا کو رفیق سفر بنانا چاہتے تھے جبکہ پال سیلاس کو پسند کرتے تھے۔ بائبل کی کتاب اعمال۔ ۵۱ آیت ۵۳ تا ۱۴ میں اس بارے میں ہے کہ:

> گر پولس اور برناباس انطاکیہ میں ہی رہے، اور بہت سے اور لوگوں کے ساتھ خداوند کا کلام سکھاتے اور اس کی منادی کرتے رہے، چند روز بعد پولس نے برناباس سے کہا کہ جن جن شہروں میں ہم نے خدا کا کلام سنایا تھا آؤ پھر ان میں چل کر بھائیوں کو دیکھیں کہ کیسے ہیں؟ اور برنابس کی صلاح تھی کہ یوحنا کو جو مرقس کہلاتا ہے اپنے ساتھ لے چلیں، مگر پولس نے یہ مناسب نہ جانا کہ جو شخص پمفولیہ میں کنارہ کرکے اس کام کے لیے ان کے ساتھ نہ گیا تھا اس کو ہمراہ لے چلیں؟ پس ان میں ایسی سخت تکرار ہوئی کہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، اور برناباس مرقس کو لے کر جہاز پر قبرص چلا گیا، مگر پولس نے سیلاس کو پسند کیا اور بھائیوں کی طرف سے خداوند کے سپرد ہو کر روانہ ہوا اور کلیساؤں کو مضبوط کرتا ہوا سوریہ اور کلکیہ سے گزرا۔

لیکن صرف یہ معمولی سی بات ہمیشہ کی جدائی کا سبب نہیں ہوسکتی۔کیونکہ اختلاف اور جدائی کو بیان کرنے کے لیے جو یونانی لفظ (Paraxumus) استعمال کیا گیا ہے وہ غیر معمولی طور پر سخت ہیں۔ لیکن اس علیحدگی کی اصل وجہ کیا تھی، اس بارے میں ساری بائبل خاموش نظر آتی ہے۔ ہمیں صرف پولس کا ایک بیان ملتا ہے جس سے اس اختلاف پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

> جب کیفا (پطرس) انطاکیہ میں آیا تو میں نے روبرو ہو کر اس کی مخالفت کی، کیونکہ وہ ملامت کے لائق تھا، اس لیے کہ یعقوب کی طرف چند شخصوں کے آنے سے پہلے وہ غیر قوموں کے ساتھ کھایا کرتا تھا، مگر جب وہ آگئے تو مختونوں سے ڈر کر باز رہا اور کنارہ کیا، اور باقی یہودیوں نے بھی اس کے ساتھ ہو کر ریاکاری کی، یہاں تک کہ برناباس بھی ان کے ساتھ ریاکاری میں پڑ گیا۔ (گلتیوں۔2: 11 تا13)

یروشلم کے اکثر عیسائی پہلے یہودی تھے، جنہوں نے یہ دین قبول کرلیا تھا، اور انطاکیہ کے عیسائی پہلے بت پرست یا آتش پرست تھے۔ بائبل میں پہلی قسم کے لوگوں کے لیے یہودی مسیحی (Jewish Christian) اور دوسری قسم کے لوگوں کے لیے غیر قوم (Gentile Christians) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہودی مسیحوں کا کہنا تھا کہ ختنہ کرانا اور شریعتِ موسوی کی تمام رسومات پر عمل کرنا

ضروری ہے، اسی لیے انہیں مختون کہا جاتا تھا، اور غیر قوم کا کہنا تھا کہ ختنہ ضروری نہیں اس لیے انہیں نامختون کہا جاتا ہے۔ بائبل کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان نظریاتی اختلاف تھا۔ بہر حال علیحدگی کے بعد برناباس اپنے وطن قبرص (Cyprus) چلے گئے اور وہیں وفات پا کر دفن ہوئے۔

ان کی انجیل 478CE میں ان کی قبر سے دریافت ہوئی اور 496 CE تک یہ گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھی، اس کے بعد عیسائی علماء کی ایک کونسل نے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دے دیا اور پوپ سکسٹوس پنجم (1521-1590CE) کی لائبریری میں محفوظ کر دی گئی۔ اور ایک ہزار سال تک یوں ہی پڑی رہی۔ 1585 میں یہ دوبارہ ایک عیسائی راہب فرامارینو (1500CE) کے ذریعے منظر عام پر آئی جو اس نے اسی لائبریری سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد یہ انجیل منظر عام پر رہی۔

عیسائیت کی ابتدائی تاریخ

اس وقت عیسائیت جس صورت میں ہمارے سامنے ہے، اس کی تاریخ کے بارے میں ہمیں حواریوں کے حوالے سے زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم بائبل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام یہودیوں کی اصلاح کے لیے اپنے حواریوں کو مختلف آبادیوں میں بھیجا کرتے تھے۔ بعض مورخین کے نزدیک انہوں نے کشمیر اور تبت کا سفر بھی کیا، البتہ اس حوالے سے مقدس کتابوں میں کچھ معلومات میسر نہیں ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد اس تبلیغ کا کام ان کے حواریوں نے جاری رکھا۔ یہ حواری دور دراز دیہاتوں میں جاتے اور لوگوں کو حضرت مسیح علیہ الصلوۃ السلام کا پیغام سناتے تھے۔

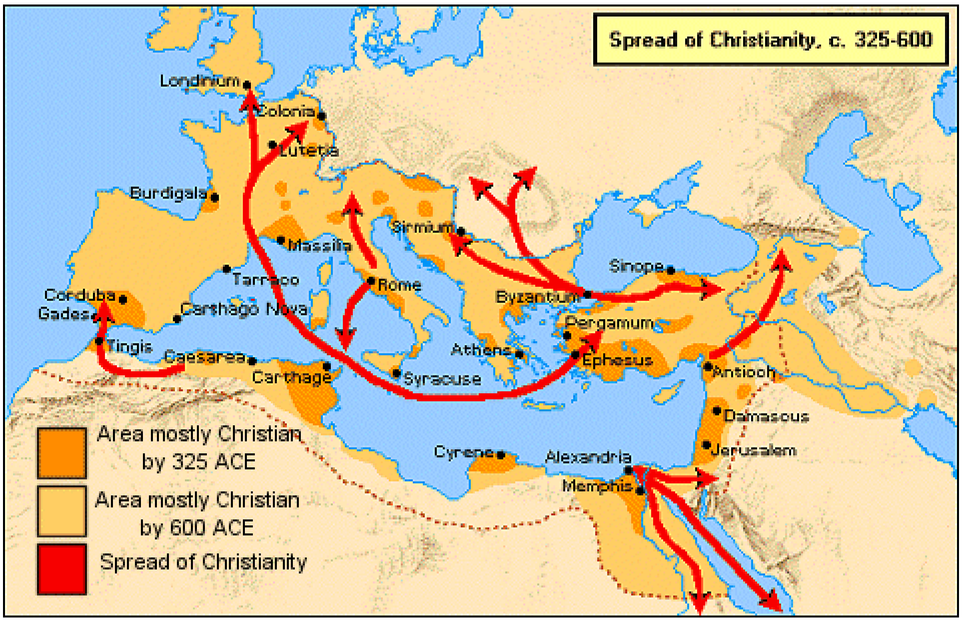
حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے بعد ان کے پیروکار میں بعض معاملات میں نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ البتہ شریعت کی پابندی کے حوالے دو گروہ وجود میں آئے۔ ایک کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی تعلیمات پر بلا کسی تاویل عمل کرنا لازم تھا' جبکہ دوسرے کے نزدیک عیسائیت کے فروغ کے لیے ان تعلیمات میں تاویل جائز تھی۔ پہلے گروہ میں برناباس اور دوسرے گروہ کے حامی ساؤل پال تھے۔ اسی بناء پر بعد ازاں دونوں میں علیحدگی بھی ہوئی۔ برناباس حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے دین کے متعلق جس قدر سنجیدہ تھے اس سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ علیحدگی کے بعد بھی انہوں نے اپنا تبلیغی مشن جاری رکھا ہو گا اور ان کے ماننے والے بھی موجود ہوں گے۔ لیکن یہ بات عجیب ہے کہ ہمیں عیسائیت کے ابتدائی دور میں پال اور برناباس دونوں کے حامیوں کا ذکر ملتا ہے، لیکن جوں ہی پال کے حامیوں کو اقتدار ملتا ہے تو برناباس کے گروہ کا وجود معدوم ہوتا جاتا ہے۔

چوتھی صدی عیسوی کی ابتداء تک عیسائیت شدید مشکلات کا شکار رہی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ اس مذہب کے ماننے والوں پر رومیوں کا تسلط تھا جو کہ یہود کی طرح ان کے خلاف بھی تھے۔ اس دور میں عیسائی مذہب باقاعدہ طور پر مرتب نہیں ہوا تھا، اور عیسائی کسمپری کی

حالت میں تھے۔۔ پھر بھی عیسائی مبلغین کی کوششوں سے رومن ایمپائر کے تقریباً سبھی علاقوں میں عیسائی کمیونیٹیز وجود میں آچکی تھیں جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ پھیل رہی تھیں۔ کبھی ان پر حکومت کی جانب سے جبر و تشدد کیا جاتا اور کبھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ جبر کے زمانے میں بعض لوگ عیسائیت سے منحرف ہو جاتے لیکن یہ زمانہ گزرنے کے بعد دوبارہ اس مذہب کو اختیار کر لیتے۔ اس دور کی بڑی مذہبی بحثوں میں یہ بحث سب سے نمایاں ہے کہ کیا ان منحرفین کو قبول کیا جائے یا نہیں؟

عیسائیت بطور سرکاری مذہب

یہ حالت تقریباً 306 تک رہی، اس کے بعد روم میں شاہ قسطنطین اول (Constantine) کی حکومت قائم ہوئی جس نے عیسائیت قبول کی اور اس مذہب کی تبلیغ و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے عیسائی علماء کو وظائف دے کر مذہبی تحقیقات کے کام میں لگایا اور کئی مذہبی مجالس منعقد کیں۔ ان مجالس (کونسل) میں 325 کی وہ کونسل انتہائی اہم ہے جو موجودہ ترکی کے شہر نیسیا (Nicaea) کے مقام پر ہوئی۔ اسی کونسل میں بائبل کو باقاعدہ مرتب کیا گیا، کئی کتابیں جعلی بھی قرار دی گئیں۔ اس کونسل میں 300 علماء شریک تھے جنہوں نے مختلف اناجیل کو قبولیت و رد کی سند دی۔



عیسائیت۔ تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک۔(28 Feb 2013) http://www.ourprg.com

عیسائی عقائد کو باقاعدہ طور پر اسی مجلس میں مرتب کیا گیا تھا، اسی مجلس میں تثلیث کے منکرین کو عیسائیت سے خارج قرار دیا گیا۔ اس کے بعد جو بھی مجالس ہوئیں، وہ دراصل اس مجلس میں طے کیے جانے والے عقائد کی تشریح و توضیح کے لیے ہی کی گئیں۔ اس کونسل سے قبل تثلیث عیسائی فرقوں کے مابین متفق علیہ عقیدہ نہیں تھا، لیکن عیسائیت کو باقاعدہ طور پر مرتب کرتے ہوئے اس کونسل اہم

علماء نے عقیدۂ تثلیث کے منکرین کو عیسائیت سے خارج قرار دیا گیا۔اس دور کو عیسائی مورخین عہد مجالس(Age of councils) کہتے ہیں۔اس دور سے پادریوں نے ایک سرکاری تنظیم کی شکل اختیار کرلی جس کا ایک باقاعدہ پیشوا ہوتا تھا۔اس تنظیم کو کلیسا(Church) کہا جاتا ہے۔عیسائیت کا یہ سنہرا دورِ تبلیغ تقریباً 540 تک رہا اور رومن ایمپائر کے ساتھ ساتھ افریقہ اور جزیرہ نما عرب میں عیسائیت پھیلتی چلی گئی۔رومن ایمپائر کی باج گزار افریقی ریاست حبشہ (Axom) میں بھی عیسائیت تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔

رومن ایمپائر کا زوال

370 کے قریب عیسائیت دو بڑی سلطنتوں میں بٹ چکی تھی: ایک ایسٹرن رومن ایمپائر کہلاتی تھی اور اس کا مرکز قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) تھا اور اس کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا کو بطریق(Patriarch) کہتے تھے؛ جبکہ دوسری ویسٹرن رومن ایمپائر کہلاتی تھی اور اس کا مرکز اٹلی کا شہر روم تھا جس کے پیشوا کو پوپ کہا جاتا۔ پاپائیت کا آغاز دراصل اسی دور میں ہوا تھا۔ان دونوں سلطنتوں کے مابین زبان کے فرق کی وجہ سے کئی مذہبی تنازعات بھی پیدا ہوئے۔جس کی وجہ سے بعد میں 1045 میں دونوں کلیسا باقاعدہ طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔اس طرح سے عیسائیوں کے دو بڑے فرقے ایسٹرن آرتھوڈوکس اور رومن کیتھولک وجود میں آئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ویسٹرن رومن ایمپائر شمالی یورپ کے وحشی قبائل کے حملوں کی تاب نہ لا کر زوال پذیر ہوگئی البتہ ایسٹرن رومن ایمپائر طویل عرصے تک زندہ رہی۔

بعد ازاں گریگوری (Gregory 604-540) پوپ بنے۔چھٹی صدی عیسوی کے اس دور سے لے کر1500 تک کے دور کو اہل مغرب دورِ تاریک (Dark Ages)"کہتے ہیں۔گریگوری نے رومی کلیسا کو انتہائی مستحکم کیا اور پاپائیت کے نظام اور اس کے اختیارات کو بھی قوت حاصل ہوئی، حتیٰ کہ سیاسی معاملات میں بھی کسی قسم کی پیش رفت پوپ کی اجازت کے بغیر تصور نہیں کی جاسکتی تھی۔

اس زمانے میں اسلام جزیرہ نما عرب سے ایک بڑی طاقت بن کر اٹھا اور مسلمانوں نے ایسٹرن رومن ایمپائر کے ایشیائی اور افریقی مقبوضات کو فتح کرلیا۔مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں زیادہ نقصان عیسائیوں کا ہوا اور ایسٹرن رومن ایمپائر صرف ترکی اور یونان کے چند علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔تاہم عیسائی مبلغین نے مغرب کی جانب پیش قدمی جاری رکھی اور ان کی دعوت کے نتیجے میں شمالی اور مغربی یورپ کی اقوام، جو ابھی وحشی تھیں، عیسائیت کے دائرے میں داخل ہوتی چلی گئیں۔اس طرح سے عیسائیت یورپ کا غالب مذہب بن گیا۔

صلیبی جنگیں *(Crusades)*

پوپ اربن ثانی (1042-1099) کی سرپرستی میں صلیبی جنگیں بھی 1095 سے 1291 تک کے اسی عرصے میں ہوئی۔ فلسطین

بالخصوص بیت المقدس پر عیسائی قبضہ بحال کرنے کے لیے یورپی کلیسا نے کئی جنگیں لڑیں جنھیں تاریخ میں صلیبی جنگوں (Crusades) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ جنگیں فلسطین اور شام کی حدود میں مسلمانوں کے خلاف لڑی گئیں۔ صلیبی جنگوں کا یہ سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہا اور اس دوران نو بڑی جنگیں لڑی گئیں جس میں لاکھوں انسان قتل ہوئے۔ شروع میں عیسائیوں کو فتح حاصل ہوئی اور انہوں نے 1099 میں یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد موجودہ شام، لبنان اور فلسطین کے علاقوں میں متعدد عیسائی ریاستیں قائم ہوئیں۔ لیکن مسلمان ایک بار پھر صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں متحد ہوئے اور انہوں نے عیسائیوں کو پے در پے شکستیں دے کر واپس یورپ جانے پر مجبور کر دیا۔ 1187 میں یروشلم واپس مسلمانوں کے پاس آ گیا اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں شام میں عیسائی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا۔

یورپ کی بیداری کا دور اور پروٹسٹنٹ ازم

اس دوران جنگوں میں بھی عیسائی عوام کو بالجبر بھیجا جاتا تھا، اور ایک نیا رواج معافی نامہ تھا، جس کی ابتداء یوں ہوئی کہ پوپ اربن دوم نے یہ اعلام کیا کہ جو لوگ صلیبی جنگوں میں شریک نہیں ہو سکتے وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیں اس کے بدلے انہیں معافی نامہ دیا جائے گا جو ان کے لیے یقینی نجات کا ذریعہ ہو گا۔ لیکن بعد ازاں پوپ لیو دہم (1475-1521) تک یہ رواج یہ صورت اختیار کر گیا کہ معافی نامے باقاعدہ ایجنسیوں پر فروخت ہونے لگے، ہر ایک گناہ کے لیے الگ الگ معافی نامہ ہوتا تھا۔ جس شخص کا جی چاہتا، وہ گناہ کر کے پادریوں سے معافی نامے حاصل کر لیتا۔ اس کے نتیجے میں عیسائی دنیا میں اخلاقی انحطاط پیدا ہوا جس کی سرپرستی مذہبی علما کر رہے تھے۔

علمی اعتبار سے بھی اس وقت عیسائیوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے، کوئی بھی شخص دین کی تشریح و توضیح پوپ کے خلاف سائنسی و عقلی انداز میں کرتا تو اسے سخت سزائیں دی جاتیں، عیسائیت کے کئی قدیم فرقے اسی دور میں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ 1478 میں احتساب (Inquisition) کی مجلس بھی اسی مقصد کے تحت قائم کی گئی تھی کہ جس شخص پر بھی شبہ ہو کہ وہ دین میں اپنی عقل سے کام لیتا ہے اسے گرفتار کر کے زندہ جلا دیا جائے۔ معروف سائنسدان گلیلیو (Galileo 1564-1642) کو اس گناہ کی پاداش میں توبہ کرنے پر مجبور کیا گیا کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس کے برعکس کلیسا کا نظریہ یہ تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تین لاکھ چالیس ہزار لوگوں کو اس جرم کی پاداش میں مختلف نوع کی سزائیں دی گئیں۔ یہ قانون بھی 1515 میں پاس کیا گیا کہ کوئی بھی کتاب کلیسا کی منظوری کے بغیر شائع کرنا سنگین جرم ہے۔ ان سب مظالم کی وجہ سے ایک طرف کلیسا کے خلاف عوام میں نفرت کا جذبہ بڑھنے لگا تو دوسری طرف بہت سے لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ مذہب اور

سائنس ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یہی خیال آگے جا کر دہریت(Atheism) کی صورت اختیار کر گیا جس نے سارے مغرب کو اپنی لپیٹ میں لیا۔

کلیسا کے مظالم کے خلاف چند ایسے مصلحین کھڑے ہوئے جنہوں نے اس ظلم کے خلاف کھلم کھلا آواز بلند کی اور اس نظام پر ضرب کاری کی۔ان میں پیٹر والڈو (1140-1218)، جان ٹولر(1290-1361) اور جان وائی کلف (1320-1384) جیسے مصلحین شامل تھے۔پوپ کی مخالفت کرنے والے ان مصلحین کو اگرچہ سخت سزائیں دی گئیں، ان پر کفر کے حکم بھی لگائے گئے' لیکن یہ اس رویے نے بعد کے ایک بڑے مصلح مارٹن لوتھر(1483-1546) کے لیے راہ ہموار کی۔

پاپائیت کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں میں جس شخص نے انقلابی روح پھونکی، وہ مارٹن لاتھر تھے۔لوتھر جرمن ریاست سکسنی (Saxony) کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ غربت کی وجہ سے ان کی تعلیم کا انتظام نہیں ہو سکا تھا، چنانچہ انہوں نے خود کما کر اپنی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ قانون کی تعلیم حاصل کر کے ان کی توجہ مذہب کی طرف مروز ہوئی جس میں وہ پادری کے عہدے پر فائز ہوئے۔انہوں نے یورپ کا دورہ کیا اور ٹولر کی وغیرہ تصانیف سے بے حد متاثر ہوئے۔اس سفر نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ یورپ روحانی پیشوائی کا اہل نہیں ہے اور پاپائیت ان کے مذہب کے خلاف ہے' چنانچہ واپس آتے ہی انہوں نے پوپ کی شدید مخالفت شروع کر دی۔انہوں نے معافی نامے کو باطل قرار دیا اور کلیسا کی طرف سے ہونے والے تمام مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔21 اکتوبر 1517 کا دن نہ صرف مارٹن لوتھر بلکہ عیسائیت کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے، اس دن لوتھر نے باقاعدہ طور پر پوپ کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ جرمنی کے شہر وٹن برگ(Wittenberg) کے گرجے کی دیوار پر لاطینی زبان میں طویل عبارت لکھ کر آویزاں کر دی جس میں پوپ کے معافی نامہ دینے کے اختیار پر شدید تنقید کی گئی تھی۔اس زمانے کے پوپ لیو دہم (1475-1521) تھے جو کہ مارٹن کی اس بغاوت سے بے خبر نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے لوتھ کے اکتالیس عقائد کو باطل قرار دے کر عوام سے ان کی کتابیں جلا دینے کی اپیل کی۔اس سلسلے میں لوتھر کو علماء کے سامنے طلب کیا گیا لیکن لوتھر اپنے خیالات پر ڈٹے رہے اور اپنے موقف سے ہٹنے پر کسی صورت راضی نہ ہوئے۔چونکہ اب لوتھر کے حامیوں کی تعداد ہزاروں کی تھی جن میں کئی شہزادے بھی شامل تھے اس لیے انہیں سخت سزا دینا ممکن نہ تھا۔ تاہم انہیں ایک سال کے لیے قید کیا گیا جہاں انہوں نے بائبل کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا۔

لوتھر کی تحریک کی وجہ سے عیسائیت پروٹسٹنٹ اور کیتھولک میں تقسیم ہو گئی۔پروٹسٹنٹ فرقہ جدید رحجان کا حامل تھا،لوتھر کا اگرچہ 1546 میں انتقال ہو گیا لیکن ان کی تحریک کا اثر ان کے بعد بھی کافی عرصہ قائم رہا۔عیسائیت میں مذہبی اصلاحی تحریک کے حامیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔لوتھر کے بعد اس اصلاحی کام کو زونگلی، جان کالون اور جان ناکس نے آگے بڑھایا۔

ان اصلاحی تحریکوں سے یہ فائدہ ضروری ہوا تھا کہ لوگ کرپٹ عیسائی علماء کے مظالم کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے اور ان سے بغاوت پر اتر آئے تھے لیکن ان تحریکوں کے اثر سے لوگ کلیسا سے دور ہوتے جارہے تھے۔ اس رجحان کو دیکھتے ہوئے کیتھولک کلیسا کے بعض مخلصین نے یہ کوشش کی کہ چرچ میں اصلاح کی جائے۔ اسی کوشش کے لیے آسٹریا کے مقام ٹرنٹ پر 1545 اور 1552 میں کونسلز کا انعقاد ہوا۔ جس میں بنیادی ایجنڈا یہ قرار دیا گیا کہ دونوں کلیساؤں کے اختلافات کو ختم کیا جائے اور عوام کو دوبارہ کلیسا سے جوڑا جائے۔ اگرچہ کلیساؤں میں اختلافات کوششوں کے باوجود ختم نہ ہو سکے۔ اس کونسل میں پوپ کے اختیارات کو برقرار رکھا گیا تاہم انہوں نے پادریوں کی زندگیوں کو اخلاقی طور پر اچھی اور پاک بنانے کے لیے اصول مرتب کیے گئے۔ لیکن اصلاحی تحریکوں کے رد عمل میں اٹھنے والی اس تحریک میں دوبارہ تشدد کے عناصر نظر آنے لگے۔ کیوں کہ اس تحریک کے تحت احتساب یا انکوئزیشن کے ادارے کی تشکیل دی گئی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ کوئی شخص پروٹسٹنٹ مسلک کا اقرار کرتا تو اسے سخت سزائیں دی جاتیں۔ اسی انتہاپسندانہ رویے کے سبب رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان مذہبی اختلافات کی بناء پر تیس سالہ جنگ ہوئی جو کہ 1648-1618 کے درمیان جاری رہی۔ اس میں زیادہ تر جنگیں جرمنی میں لڑی گئی جن میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ اس جنگ میں براعظم یورپ کے کئی اہم ممالک نے حصہ لیا۔ تیس سال گزرنے کے بعد یہ جنگ ویسٹ فالن معاہدہ کے ساتھ ختم ہوئی لیکن اس جنگ سے جو مسائل پیدا ہوئے ان پر جنگ ختم ہونے کے بعد بھی طویل عرصے تک قابو نہ پایا جا سکا۔

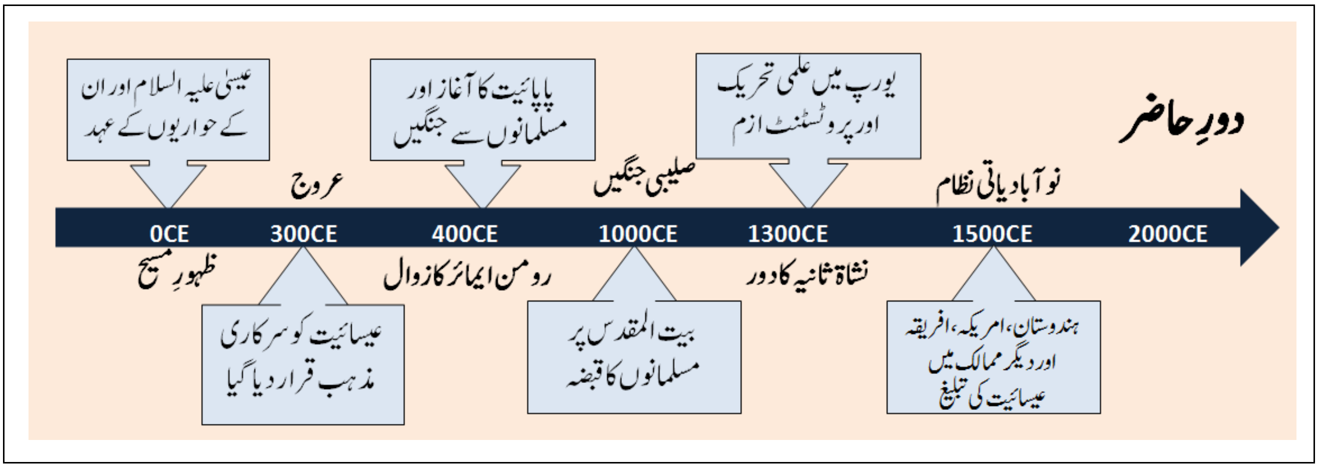
عیسائیت دور جدید میں

دورِ جدید میں عیسائیت آبادی کے اعتبار سے دنیا کا بڑا مذہب مانا جاتا ہے۔ ایشیاء، افریقہ اور امریکہ میں اس مذہب کی ترویج واشاعت کی ایک اہم وجہ کالونیل ازم یعنی نو آبادیاتی نظام ہے۔ نو آبادیاتی نظام سے مراد کسی ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے علاقے میں جا کر اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا اور وہاں قبضہ کرنا ہے۔ عام طور پر جہاں بھی نو آبادی قائم کی جاتی ہے وہاں کے اصل باشندوں کو زیر نگیں لا کر ان پہ اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت بھی مسلط کیے جاتے ہیں۔ تاریخ میں اس سے پہلے دوسرے علاقوں پر قبضہ کر کے انہیں غلام بنانے کا رواج رہا ہے مگر جدید دور میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ایک قوم کا دوسری قوموں پر مسلط ہونے کے اس عمل کا آغاز چودھویں صدی میں رومن ایمپائر نے کیا۔ یورپ میں مقیم عیسائیوں نے افریقہ، امریکہ اور ایشیاء میں اپنی نئی آبادیاں قائم کیں۔

نو آبادیاتی کا کہ رجحان اہل یورپ کے لیے نہ صرف معاشی اور سیاسی طور پر فائدہ مند رہا بلکہ اس سے ان کے مذہب کی بھی بہترین تبلیغ ہوئی۔ نئی آبادی قائم کرنے والے عیسائیوں میں کئی ایک مشنریز بھی ہوتی تھیں۔ ان مشنریز کے لوگ مقبوضہ علاقے میں اپنے مذہب کی بھرپور اشاعت کرتے تھے۔ ہندوستان میں عیسائیت کی باقاعدہ تبلیغ سولہویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے ہوئی۔ بعد ازاں

جب برصغیر پر انگریزوں کا تسلط ہوا تو یہاں کے پادریوں کو سرکاری سطح پر سرپرستی حاصل ہو گئی اور تبلیغی کوششیں مزید تیز ہوتی گئی۔ اسی طرح اٹھارویں کے آخر میں پروٹسٹنٹ عیسائی جنوبی افریقہ میں آباد ہوئے اور یہاں اپنے مذہب کی تبلیغ کی۔ برصغیر اور افریقہ میں ان پادریوں نے مختلف طریقوں سے زرِ کثیر خرچ کر کے عیسائیت کی تبلیغ کی مہم شروع کی۔ سماجی خدمات، علمی خدمات، مناظرے غرض کہ ہر طریقے سے عیسائیت کے فروغ کے لیے یہاں عیسائی آبادکاروں نے جدوجہد کیں جس کے نتیجے میں ایک بڑی تعداد نے عیسائیت کو اپنالیا۔

عیسائیت کی تاریخ کو ہم اس ٹائم لائن کی شکل میں بیان کر سکتے ہیں:



مقدس کتابیں

عیسائیت کی مقدس کتاب بائبل ہے۔ جو کہ دو حصوں پر منقسم ہیں۔ عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید۔

عہد نامہ عتیق (Old Testament)

بائبل کا یہ حصہ یہودیوں اور عیسائیوں میں مشترک ہے۔ اس میں کل 39 کتابیں ہیں۔ تاہم عیسائیت کا ایک فرقہ پروٹسٹنٹ ان میں سے سات کتابوں کو جعلی قرار دیتا ہے۔ اس کا تعلق زمانہ قبل از مسیح سے ہے اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے منسوب کتاب تورات کے علاوہ بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے صحائف شامل ہیں۔ بائبل کا یہ حصہ تخلیق کائنات سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی ولادت سے پہلے تک کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے یہودیت کا باب دیکھیے۔

عہد نامہ جدید (New Testament)

عہد نامہ جدید وہ اولین تحریریں ہیں جو ہمارے پاس عیسائیت کے ابتدائی عقائد، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام اور ان کے بعد کے حالات جاننے کا واحد ذریعہ ہے۔ مجموعی طور پر عہد نامہ جدید میں ستائیس متفقہ کتابیں شامل ہیں، جن میں چار اناجیل ہیں: انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل یوحنا۔ ایک اہم کتاب رسولوں کے اعمال ہیں اور اس کے علاوہ کچھ خطوط ہیں جو پال اور دیگر شخصیات نے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۴ متنازعہ کتابیں بھی ہیں۔

1۔ اناجیل اربعہ (Gosples)

لفظ انجیلا صلاً یونانی زبان کا لفظ ایونجلیون (Evangelion) ہے، جس کے معنی وہ انعام جو خوش خبری پر عطا کیا جائے۔ اناجیل اصل میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کی سوانح حیات ہیں، یہ اناجیل حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے بعد ان کے حواریوں اور ان حواریوں کے شاگردوں نے مرتب کیں۔ لوقا نے اپنی انجیل لکھتے ہوئے ابتداء[1] میں ہی اس بات کی تصریح کی ہے کہ ان کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے حالات و واقعات قلم بند کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ عیسائی علماء نے تقریباً بائبل کی 158 کتابوں کا ذکر کیا جس میں چند ہی سند قبولیت حاصل کر سکی۔ ان انجیلوں میں متی اور یوحنا کے علاوہ بقیہ دو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے حواریوں میں شامل نہیں تھے بلکہ ان کی تاریخی حیثیت حواریوں کے شاگردوں کی ہے۔

انجیل کی ترتیب و تالیف کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان ارامی تھی۔ جب کہ موجودہ تمام اناجیل کے ماخذ عبرانی اور یونانی زبان کے ترجمے ہیں۔ انجیل کے سب سے پرانے تین نسخوں کی تاریخ چوتھی صدی عیسوی ہے۔

اناجیل اربعہ میں سب سے قدیم ہونے کی بناء پر انجیل مرقس خاص اہمیت حاصل ہے، اس کے مصنف مرقس (Mark) تھے جو کہ یونان کے رہنے والے یہودی النسل عیسائی تھے۔ ابتداء میں وہ پال اور برناباس کے ساتھ رہا کرتے تھے پھر پطرس کی ساتھ ہو گئے۔ 64 میں قیصر نیرو نے جب عیسائیوں کے قتل عام میں پطرس کو بھی شہید کر دیا تو مرقس نے اس حادثے کے بعد یہ انجیل لکھی۔ عیسائی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرقس حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے صحابی نہیں تھے، بلکہ انہوں نے حضرت مسیح کے اقوال کے بارے جو کچھ اپنے استاد پطرس سے سنا تھا' اس انجیل میں لکھ دیا۔ بعض مورخین کے نزدیک انہوں نے یہ انجیل لاطینی یا ارامی زبان

[1] باب 1: آیت 1

میں لکھی تھی لیکن اس بارے میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے، آج اس انجیل کا سب سے پرانا نسخہ یونانی زبان میں ہی موجود ہے۔ اس کی تصنیف کا زمانہ 70-56 کا درمیانی عرصہ ہے۔

سب سے بڑی انجیل کے مصنف متی (Mathew) ہیں۔ ان کے حالات زندگی کے متعلق ہمیں عہد نامہ جدید میں کوئی بیان نہیں ملتا۔ ایک متی، حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کے صحابی تھے مگر وہ اس کتاب کے مصنف نہیں تھے۔ دیگر اناجیل سے یہ اس لیے بھی ممتاز ہے کہ دوسری اناجیل کی طرح یونانی کے بجائے عبرانی زبان میں لکھی گئی۔ پروفیسر ہانیک (Harnack 1851–1930) نے اپنی کتاب What is Christianity? میں اس کا زمانہ تالیف 80 تا100 لکھا ہے جو کہ دیگر شواہد کی بناء پر قرین قیاس ہیں۔

تیسری انجیل کے مصنف لوقا (Lock) ہیں۔ یہ انطاکیہ کے رہنے والے ایک غیر یہودی طبیب اور مورخ تھے۔ یہ کئی بار پولوس کے ساتھ تبلیغی سفر کر چکے ہیں۔ ان کی طرف دو کتابیں منسوب ہیں ایک انجیل لوقا اور دوسری رسولوں کے اعمال۔ لوقا مسیح کے حواریوں میں سے نہیں تھے۔ اپنی انجیل کی ابتداء میں ہی انہوں نے لکھا ہے کہ یہ انجیل حضرت مسیح السلام کی خدمت میں رہنے والوں سے معلوم کر کے ایک یونانی شخص تھیفلس کی فرمائش پر لکھی۔

چوتھی انجیل کے مصنف یوحنا (John) ہیں۔ یہ انجیل اپنے طرز اور مضامین کے اعتبار سے بقیہ انجیلوں سے منفرد ہے۔ اس انجیل کا طرز فلسفیانہ ہے جس کی واضح مثال اس انجیل کا پہلا فقرہ ابتداء میں کلام تھا، اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا ہے۔ جہاں دوسری اناجیل حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو خدا کے خادم اور ابن آدم کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، وہیں یہ انجیل ان کی الوہیت پر زور دیتی ہے۔ یہ یوحنا کون ہیں، اس بارے میں عیسائی مورخین کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ یوحنا حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کے حواری تھے، جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ یہ ایک دوسرے یوحنا تھے جو ایشیائے کوچک (Asia Minor) یعنی ترکی کے رہنے والے تھے اور پہلی صدی کے آخر میں گزرے۔ مکاشفات یوحنا بھی انہی کی تصنیف ہے۔ اس انجیل کا زمانہ تالیف حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے بعد تقریباً 90 بتایا جاتا ہے۔

2۔ رسولوں کے اعمال (Works of Apostles)

یہ عہد نامہ جدید کی پانچویں کتاب ہے جو لوقا کی طرف منسوب ہے، اس میں پطرس اور پولوس کے حالات درج ہیں۔ پہلی صدی میں عیسائیت کی دعوتی تاریخ اس میں درج کی گئی ہے۔ حواریوں نے کس طرح عیسائیت کی دعوت کو رومن ایمپائر کے طول و عرض میں پھیلایا، یہ اس کتاب کا موضوع ہے۔

3۔پال کے خطوط (Pauline Epistles)

ہم پڑھ چکے ہیں پال نے عیسائی ہونے کے بعد تبلیغ میں اہم کردار ادا کیا، انہوں نے کئی تبلیغی سفر کیے اور لوگوں کو تعلیمات مسیح علیہ الصلوۃ السلام کی روسے ہدایات دیں۔ انہوں نے مختلف شہروں کے عیسائیوں کو خطوط روانہ کیے جن میں سے چودہ خطوط عہد نامہ جدید میں شامل ہے۔ یہ چودہ خطوط جو انہوں نے مختلف قوموں کو لکھے، عیسائیت کے عقائد اور تشکیل اور اس کی تشریح و توضیح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا سابقہ دور میں عالم اور حامل مطالعہ ہونے کا اثر ان کے خطوط میں بھی واضح ملتا ہے جہاں وہ دینیات اور عیسائی عقائد کے حوالے سے لکھتے ہوئے منطقی انداز اپناتے ہیں۔ ان کے خطوط کی اہم خصوصیت ان کا مذہبی جوش سے معمور ہونا ہے۔

4۔ دیگر خطوط

ان میں پطرس اور یعقوب کے خطوط شامل ہیں۔

5۔ یوحنا کے خطوط اور مکاشفات

یوحنا کے مکاشفات (The Book of Revelation) عہد نامہ جدید کی آخری کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین خطوط بھی شامل ہیں۔ عیسائی علماء کا اعتقاد ہے کہ یوحنا اپنے مسیحی ایمان کی وجہ سے یونان اور ترکی کے درمیان واقع سمندر میں پتمس نامی جزیرے پر جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ وہیں انہوں نے کچھ سچے خواب دیکھے جو انہوں نے اس کتاب میں بیان کر دیا۔ ان کی انجیل کی طرح یہ کتاب بھی 96-90 کے عرصے میں یونانی زبان میں لکھی گئی۔

عیسائیوں کے عقائد

عیسائیت میں مندرجہ ذیل عقائد کی حیثیت اس مذہب کی بنیاد ہے۔

1۔ تصور خدا: عیسائی مذہب وجودِ خداوندی کے متعلق دوسرے ابراہیمی مذاہب سے مختلف نہیں، وہ بھی خدا کی تمام صفات کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا اقرار کرتے ہیں۔ البتہ یہ مذہب تصور خدا کے باب میں عقیدہ تثلیث کی وجہ سے ممتاز ہے۔

2۔ تثلیث (Trinity): تثلیث کے متعلق عیسائیوں کے ہاں ایک مشہور فلسفہ ہے تین ایک میں، ایک تین میں۔ یہ فلسفہ اس عقیدے کا آئینہ دار ہے کہ خدا تین اقانیم (Persons) سے مرکب ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ اس عقیدے کی تشریح و توضیح میں عیسائی علماء کا اختلاف رہا ہے۔ ہمیں اس عقیدے کے متعلق کوئی واضح اور آسان تشریح معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ عام عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق باپ، بیٹے اور روح القدس کے مجموعے کا نام خدا ہے۔ باپ سے مراد خدا کی تنہا ذات ہے، بیٹے سے مراد خدا کی

صفت کلام (Word of God) ہے جو مجسم صورت میں زمین پر آ کر تمام انسانوں کی نجات کا سبب بنا اور روح القدس سے مراد ان دونوں کے درمیان محبت کی صفت ہے۔ البتہ بعض عیسائی کنواری مریم کو تیسرا اقنوم مانتے ہیں۔ بہر حال اس عقیدے کے مطابق باپ خدا ہے، بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا، لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا ہے۔ عیسائی، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کو اس خدا کا انسانی وجود مانتے ہیں اور انہیں خدا قرار دیتے ہیں۔

عیسائی عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو صلیب پر پھانسی دے دی گئی جس سے ان کی موت واقع ہوئی، البتہ اس ضمن میں یہ بات ہمیں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عیسائیوں کے مطابق یہ پھانسی خدا کو نہیں دی گئی بلکہ خدا کے انسانی مظہر یسوع کی دی گئی کو اس صورت میں ایک مخلوق تھے۔

3۔ نبوت ورسالت: نبوت ورسالت پر یقین رکھنا بھی عیسائیت کا اہم عقیدہ ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے جس پر خدا کی جانب سے وحی نازل ہوتی ہے اور جس کو انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نبوت انسان اور خدا کے درمیان سفارت کے اس نظام کو کہتے ہیں جس کی تکمیل نبی کے ذریعے کی جاتی ہے، اسی نظام کے تحت انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا نے وقتاً فوقتاً دنیا میں مختلف ایسے بندے بھیجے جو اوصادف کے اعتبار سے عام انسانوں میں ممتاز ہوتے ہیں اور وحی والہام کے ذریعے وہ انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

عقیدہ رسالت کے ضمن میں دوسرا اہم عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے رسولوں(Apostoles) پر یقین کرنا ہے۔ ان رسولوں سے مراد انبیاء کرام علیہ الصلوۃ السلام نہیں بلکہ وہ حواری ہیں جنھیں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام مختلف آبادیوں میں تبلیغ کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

4۔ آخرت: مسلمانوں کی ہی طرح عیسائی عقیدے کے مطابق ہر شخص کو موت کے بعد زندہ ہو کر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، جس کے نتیجے میں وہ جہنم یا جنت (کی صورت میں سزا و جزا) کا مستحق ہو گا۔ اس زندگی کا نام اخروی زندگی ہے اور اس زندگی پر ایمان لانے کا نام ایمان بالآخرت ہے۔

5۔ حیاتِ ثانیہ: یہ عقیدہ دراصل عقیدہ مصلوبیت کی ہی ایک کڑی ہے۔ یہ عقیدہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ الصلوۃ السلام مصلوب ہونے کے بعد دفن کیے گئے تو تین دن بعد پھر سے زندہ ہو گئے اور حواریوں کو کچھ ہدایات دینے کے بعد آسمان پر لوٹ گئے۔ اب وہ ایک خاص وقت میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔

6۔ صلیب مقدس: چونکہ عیسائیوں کا عقیدے ہے کہ حضرت عیسیٰ السلام کو مصلوب کیا گیا، اسی وجہ سے عیسائیت میں صلیب کا نشان

(+) انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ میں ہمیں اس علامت کا ثبوت عیسائیت کے حوالے سے دوسری صدی تک نہیں ملتا، تاہم قدیم تاریخ میں ہمیں ہند، یونان، مصر، چین اور وسطی امریکہ کے لوگوں میں یہ علامت کچھ بدلی ہوئی صورت میں ملتا ہے۔

7۔ کفارہ: عقیدہ کفارہ عیسائیت کی بنیاد ہے۔ عیسائیت کے علم عقائد میں کفارہ سے مراد یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا علیہما الصلوۃ السلام نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا کر جو گناہ (Original Sin) کیا تھا، اس کی وجہ سے ہر انسان اس گناہ کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یسوع مسیح نے صلیب پر جان کی قربانی دے کر تمام بنی آدم کو اس گناہ کے بوجھ سے نجات دی ہے۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ حضرت مسیح علیہ الصلوۃ والسلام نے انسانیت کے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے بلکہ یہ صرف اسی ابتدائی گناہ کے بوجھ کا کفارہ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا نے جب توبہ کر لی تھی اور اللہ تعالی نے انہیں معاف کر دیا تھا تو پھر ان کی اولاد میں سے کوئی اس گناہ کا بوجھ لے کر پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر انسان اپنی پیدائش کے وقت گناہوں سے پاک ہوتا ہے اور اس کی زندگی کی سلیٹ صاف ہوتی ہے۔ پھر وہ زندگی بھر اس پر نیک یا بد اعمال ریکارڈ کرواتا رہتا ہے۔

عبادات ورسوم

عیسائیوں کے ہاں متعدد عبادات اور مقدس رسوم (Sacraments) انجام دی جاتی ہیں جن میں نماز نمایاں ہے۔ کیتھولک حضرات کے ہاں سات رسوم انجام دی جاتی ہیں۔ پروٹسٹنٹ حضرات بھی ان میں سے بعض رسموں کو انجام دیتے ہیں۔

نماز یا حمد خوانی

حمد خوانی اہل کلیسا کی ایک اہم عبادت ہے۔ اس عبادت میں لوگ ہر روز صبح اور شام کلیسا میں جمع ہوتے ہیں، ایک شخص بائبل کی تلاوت کرتا ہے، دورانِ تلاوت تمام حاضرین احتراماً کھڑے رہتے ہیں، اس موقع پر دعا مانگتے ہوئے رونا اور گڑگڑانا بھی پسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے۔

عیسائیت کے فرقوں میں عبادات کی ادائیگی کے متعلق کافی فرق پایا جاتا ہے لیکن مندرجہ ذیل خصائص تقریباً سبھی چرچ کی عبادات میں پائی جاتی ہیں: اتوار کے دن چرچ میں جمع ہونا؛ بائبل کی تلاوت؛ بپتسمہ اور ضیافت؛ خطبہ۔ دور جدید میں کئی گرجاگھروں میں موسیقی کا اہتمام بھی ہوتا ہے جس میں حمدیہ گیت گائے جاتے ہیں اور حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کی شان میں نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔

رہبانیت (Asceticism)

رہبانیت وہ نظریہ ہے جس کے مطابق انسانی جسم شر کا منبع اور روح کو پاک و مقدس ہے۔ اس نظریے کی رو سے انسان اپنی جسمانی

ضروریات اور خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کچل کر روحانیت کے اعلیٰ مراتب طے کر سکتا ہے۔رہبانیت کا تصور عیسائیت کے علاوہ قدیم زمانے کے بیشتر مذاہب مثلاً ہندومت اور بدھ مت میں بھی ملتا ہے۔ جبکہ اسلام اس کو ناپسند کرتا ہے۔

مقدس رسوم (Sacraments)[1]

رومن کیتھولک حضرات کے ہاں سات رسوم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے بعض پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈوکس فرقے کے ہاں بھی رائج ہیں۔

1۔بپتسمہ (Baptism): مقدس رسوم میں سب سے نمایاں بپتسمہ ہے یہ رسم ایک مخصوص قسم کا غسل ہے۔ جو عیسائیت میں داخل ہونے والے کے لیے کیا جاتا ہے۔اس کے بغیر کوئی شخص عیسائیت کے دائرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ بپتسمہ لینے سے انسان یسوع کے واسطے ایک نئی زندگی پاتا ہے۔بپتسمہ کا طریقہ یہ ہے کہ بپتسمہ لینے والے شخص کو ایک کمرے میں لے جاکر اس طرح لٹا دیا جاتا ہے کہ اس کا منہ مغرب کی جانب ہو، اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ مغرب کی طرف پھیلا کر کہتا ہے: "اے شیطان! میں تجھ سے اور تیرے عمل سے دستبردار ہوتا ہوں۔" پھر وہ مشرق کی طرف منہ کرکے زبان سے عیسائی عقائد کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے کمرے میں لے جاکر برہنہ کیا جاتا ہے اور سر سے لے کر پاؤں تک دم کیا ہوا تیل جسم پر لگایا جاتا ہے، پھر ایک حوض میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ عیسائیت کے تمام عقائد پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں؟ جواب اثبات میں پاکر اسے حوض سے نکال کر نئے سفید کپڑے پہنائے جاتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ شخص اب گناہوں سے پاک ہو چکا ہے۔

2۔(Sacrament of Confirmation): کیتھولک عیسائیوں کے ہاں یہ رسم بپتسمہ لیتے ہوئے ادا کی جاتی ہے جس سے بپتسمہ کی ادائیگی مکمل ہو جاتی ہے۔عام طور پر یہ رسم بالغ ہونے والے نوجوانوں کے لیے کی جاتی ہے جس میں بپتسمہ لینے والے فرد سے کچھ عہد و پیماں لینے کے بعد چرچ کا بشپ فرد کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتا ہے۔اس کے بعد بشپ انگوٹھے سے اس کے سر پہ زیتون کا تیل لگاتا ہے اور اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اب مقدس روح اس کے ساتھ ہے۔

3۔ عشائے ربانی (Eucharist): انجیل متی اور لوقا کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام نے اپنی گرفتاری سے قبل اپنے حواریوں کو رات کا کھانا کھلایا تھا، اسی مجلس کی یاد میں عشائے ربانی(Eucharist) کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ مختلف ادوار میں یہ رسم تبدیل ہوتی رہی ہے لیکن اس کا بنیادی طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اتوار کے دن لوگ چرچ میں جمع ہوتے ہیں، شروع میں کچھ دعائیں اور یسوع اور خدا کی شان میں کچھ حمد گائی جاتی ہے، اس کے بعد سب ایک دوسرے کا بوسہ لے کر مبارک باد دیتے ہیں اس کے بعد روٹی اور شراب

[1] John H. Armstrong. The Catholic Mystery.page 96-98. USA: Harvest House Publishers, 1999

(وائن) پیش کی جاتی ہے، جسے دعا کے بعد تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ روٹی اور شراب کی اس ضیافت کو ''ہولی کمیونین (Holy Communion)'' بھی کہا جاتا ہے۔

4۔ اعتراف، توبہ اور کفارہ(Penance/Reconciliation/Confession): کیتھولک چرچ کے مطابق سال میں کم از کم ایک مرتبہ اقرار گناہ و توبہ کرنا ضروری ہے۔اس عمل میں عیسائی شخص چرچ میں پادری (جنھیں فادر کہا جاتا ہے) کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے اور معافی مانگتا ہے۔اس دوران دونوں کے درمیان کے پردہ یا کسی بھی قسم کی آڑ حائل ہوتی ہے۔اعتراف کے بعد میں پادری آئندہ کے لیے گناہوں کے معترف شخص کی رہنمائی کرتا ہے۔اس عمل میں نہ صرف گناہوں کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ بلکہ دل کی سبھی باتیں چرچ کے فادر سے شئیر کی جاتی ہیں۔ آخر میں فادراس دعائیں دیتے ہیں اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اب وہ شخص بیان کر دہ گناہوں سے پاک ہو چکا ہے۔

5۔ بیماروں کا مسح (Anointing of Sick): کیتھولک عیسائیوں کے ہاں یہ رسم بیماروں کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔بائبل سے مقدس کلمات پڑھتے ہوئے سر اور ہاتھوں پر زیتون کا تیل لگایا جاتا ہے اور مریض کی شفایابی کے لیے دعا کی جاتی ہے۔اگر مریض نے گناہوں کا اعتراف(Sacrament of Confession) نہ کیا ہو تو اسے مقدس تیل اور دعاؤں کی بناء پر گناہوں سے پاک سمجھا جاتا ہے۔

6۔ شادی: شادی بھی کیتھولک چرچ میں ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ان کے مطابق شادی ایک ایسا رشتہ ہے جس سے کسی بھی صورت خلاصی ممکن نہیں ہے۔اسی بنا پر کیتھولک عیسائیوں کے ہاں بعض مخصوص وجوہات کے علاوہ طلاق کرنے کو ناجائز سمجھا جاتا ہے۔

7۔ مقدس احکام: کیتھولک چرچ کے ہاں یہ رسم کسی عیسائی شخص کو چرچ کا بشوپ بنانے کے لیے ادا کی جاتی ہے۔اس رسم میں استاد یا چرچ کو بشوپ فرد کے سر پر ہاتھ رکھ کر مقدس کتاب سے کچھ آیات پڑھتا ہے اور انہیں کچھ مقدس احکام سناتا ہے۔

تہوار و مقدس ایام

عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے ہاں متعدد تہوار رائج ہیں مگر دو تہوار ایسے ہیں جو سبھی فرقوں کے عیسائی مناتے ہیں:

1۔ کرسمس: یہ عیسائیوں کا وہ سالانہ تہوار ہے جس میں اس مذہب کے ماننے والے تمام لوگ انتہائی خوش ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دن ایسا ہی پر مسرت ہے جیسا مسلمانوں کے عید کا دن۔ ہر سال 25 دسمبر کو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کا یوم ولادت منایا جاتا ہے۔اس خوشی کے موقع پر مٹھائیاں اور تحائف دیے جاتے ہیں اور مختلف طریقوں سے خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

2۔ایسٹر: عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کو جب سولی پر چڑھایا گیا تو وہ تین دن بعد دوبارہ زندہ ہو گئے تھے، یہ تاریخ 21 مارچ کی تھی، اس لیے اس خوشی کے دن کی یادگار آج بھی ہر سال اس تاریخ کو یا بعض فرقے اس کے فوراً بعد آنے والے اتوار کو مناتے ہیں۔

عیسائیت اور راہِ نجات

عیسائیت میں نجات کا دارومدار اگرچہ کئی معاملات پر مبنی ہیں؛ تاہم عیسائی علماء انجیل یوحنا[1] کے مطابق نجات کے مندرجہ ذیل تین شرائط بتاتے ہیں۔

1. انسان ایک گناہ گار کی حیثیت سے اپنے گناہوں کو پہچانتا ہو۔
2. اس بات پر یقین رکھے کہ کوئی انسانی کام نجات کا ذریعہ نہیں۔
3. نجات کے لیے صرف یسوع مسیح پر مکمل بھروسہ رکھے۔

1۔گناہ کی پہچان: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان یہ جانتا ہو کہ گناہ وہ خواہش ہے جو خدا کی ذات کے خلاف ہے، چنانچہ گناہ کرنے سے راہِ خداوندی کی مخالفت ہوتی ہے۔ اور چونکہ خدا عادل ہے اس لیے ہر گناہ گار کو سزا ملنی ضروری ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کا محور خدا کی ذات وصفات بنائے۔

2۔اعمال اور نجات: بائبل کے مطابق ہمیں اپنی نجات کے لیے اچھے اعمال پر یقین نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اچھے اعمال خداوند کے شکر کے لیے کرنے چاہیے۔ بائبل[2] میں پولوس کے قول کے مطابق ہمیں نجات اعمال سے نہیں ایمان سے ملتی ہے۔[3] یہی بات ہمیں بائبل کی کتاب رومیوں[4] میں انبیائے کرام علیہ الصلوۃ السلام کے متعلق بھی ملتی ہے کہ وہ راست باز حقیقت میں اپنے اعمال نہیں بلکہ ایمان کے بل بوتے ٹھہرے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عیسائیوں کے ہاں نیک اعمال کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ ان کا تصور یہ ہے کہ اگر انسان کی زندگی میں اچھے اعمال نہیں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ انسان یسوع مسیح پر حقیقی ایمان نہیں رکھتا۔

---

[1] باب 3۔ آیت 16 تا 18

[2] گلتیوں باب 5

[3] کتاب یعقوب۔ باب 2

[4] باب 3

3۔یسوع پر ایمان: عیسائیت کے مطابق انسانی نجات کے یہ ضروری ہے کہ انسان یسوع مسیح پر ایمان رکھے، یوحنا [1] کے مطابق یسوع پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھے کہ یسوع مسیح کو خدا نے بھیجا ہے۔ تاہم علمائے عیسائیت کے مطابق اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے متعلق مذکورہ عقائد (مصلوبیت، کفارہ، تثلیث وغیرہ) پر ایمان رکھنا ہے۔

عیسائی فرقے

یوں تو عیسائیت کی تاریخ میں ہمیں کئی فرقے مل جاتے ہیں، مثلاً یعقوبیہ، ملکانیہ اور نسطوریہ وغیرہ، لیکن دور حاضر میں اس کے تین بڑے فرقے مشہور ہیں: کیتھولک؛ آرتھوڈکس ؛اور پروٹسٹنٹ۔

رومن کیتھولک (Roman Catholic)

یہ فرقہ پطرس یا رسولی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کیونکہ اس فرقے کا دعویٰ ہے کہ اس کی بنیاد رکھنے والا پہلا شخص حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام کے حوارین میں سے پطرس ایلچی تھا۔ رومن کیتھولک بائبل میں باقی فرقوں سے زیادہ کتابیں تسلیم کرتے ہیں، ان کے ہاں طوبیاہ، یہودیت، حکمت، یشوع بن سیر اخ، باروک اور مکابین (اول و دوم) شامل ہیں۔ آسان الفاظ میں کہا جائے تو دینی معاملات میں پاپائے روم کی اطاعت قبول کرنے والوں کو کیتھولک کہا جاتا ہے۔

یہ لوگ تثلیث کے تینوں اقانیم (Persons) کے ایک جیسے درجے پر ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق روح القدس ایک ہی وقت میں باپ (خدا) اور بیٹے (یسوع) سے پیدا ہوا۔ ان کے سب سے بڑے راہنما کو پوپ کہا جاتا ہے۔ پوپ، اٹلی میں ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست میں رہتے ہیں جسے ویٹی کن کہا جاتا ہے۔ کیتھولک حضرات کے نزدیک ویٹی کن ایک مقدس مقام ہے۔ سولہویں صدی تک کیتھولک عیسائیوں کا سب سے بڑا فرقہ تھے۔ اس وقت یہ فرانس، اٹلی، بیلجیم، ہسپانیہ، پرتگال، وسطی و جنوبی امریکہ اور فلپائن میں اکثریت میں ہیں جبکہ باقی ایشائی اور افریقی ممالک میں ان کی بڑی اقلیتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک راہبوں کے لیے خنزیر کی چربی کھانا حلال ہے۔

ایسٹرن آرتھوڈکس (Eastern Orthodox)

اس فرقے کی اکثریت روس اور مشرقی یورپ کے ممالک میں ہے۔ عقائد کے اعتبار سے یہ فرقے اس لیے ممتاز ہے کہ ان کا ماننا ہے کہ

---

[1] باب 17، آیت 4

روح القدس صرف باپ سے پیدا ہوا۔ بیٹے سے نہیں۔ اسی طرح ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ معبود باپ معبود بیٹے سے افضل ہے۔ یہ اس وقت دنیا میں عیسائیت کا دوسرا بڑا فرقہ ہے۔ بنیادی طور پر بیلاروس، بلغاریہ، قبرص، جارجیا، یونان، مقدونیہ، مالدووا، مونٹی نیگرو، رومانیہ، روس، سربیا اور یوکرائن کے ممالک میں اس کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔

پروٹسٹنٹ (Protestant)

مسیحی مصلح دین مارٹن لوتھر کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ یہ فرقہ دراصل انہی کا پیروکار ہے۔ یہ لوگ پاپائیت اور خدا اور انسان کے مابین کسی بھی واسطے کے خلاف ہیں، ان کا ماننا ہے کہ گرجاگھر کو انسان کو بخشنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اور نہ ہی انسان کو راہب بننا چاہیے۔ پروٹسٹنٹ بائبل کے بعض کتابوں کو جعلی قرار دیتے ہیں جس کا ہم نے ذکر رومن کیتھولک میں کیا ہے۔

ایونجلیکل ازم(Evengelicalism)

ایونجلیکل ازم پروٹسٹنٹ عیسائیت کی ایک بااثر تحریک ہے۔ اس کا آغاز سترہویں صدی عیسوی میں ہوا اور 1730 میں یہ ایک منظم تحریک بن گئی۔ اس وقت انجیل کی اشاعت عالمی سطح پر یہی کمیونٹی کر رہی ہے۔ ایونجلیکل انجیل کے کئی پرانے ورژنز کو رتسلیم نہیں کرتے۔ یہ جماعت کی اساس چار امور پر ہے:

1. مرنے کے بعد دوبارہ زندگی پر ایمان
2. تمام کتب مقدسہ پر اناجیل کی اتھارٹی
3. عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام سے متعلق صلیب اور اس کے بعد ان کے دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان
4. وسیع پیمانے پر بائبل کی تعلیمات کی نشر و اشاعت

ان تین بڑے فرقوں کے علاوہ کئی معاملات میں اختلاف کی بناء پر اور بھی فرقے موجود ہیں اس اختلافات کی بنیاد زیادہ تر اس بات پر ہے کہ تثلیث میں باپ اور بیٹے کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ کیا حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کا جسم اور روح دونوں ہی خدا ہیں یا ان میں سے ایک خدا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ذیل میں ہم ایک چارٹ پیش کر رہے ہیں جس میں عیسائیت کی ان تینوں فرقوں کے باہم موجود اہم اختلافات واضح ہو جائے گا۔

	آرتھوڈوکس	پروٹسٹنٹ	کیتھولک
بائبل	بائبل کی 14 کتابیں جو کہ اسفار (Deuterocanonicals) کہلاتی ہیں، کو الہامی اور مقدس مانتے ہیں۔	Deuterocanonicals کو نہیں مانتے۔	مانتے ہیں۔
شادی / طلاق	صرف زنا میں ملوث ہونے پر طلاق ممکن ہے۔ ورنہ طلاق نہیں دی جاسکتی۔	طلاق ناپسندیدہ ہے لیکن جائز ہے۔	صرف چند خاص وجوہات کی بنا پر جائز ہے۔
پوپ	قابل احترام ہیں اور ان کی وہی حیثیت ہے جو ایک چرچ کے بشپ کی ہوتی ہے۔	پوپ کی حیثیت محض ایک مذہبی رہنماء کی سی ہے اور شریعت پر اتھارٹی حاصل نہیں۔	پوپ کو عیسائی شریعت پر اتھارٹی حاصل ہے۔
سات سیکریمنٹ	سات کے قائل ہیں۔ البتہ اس میں کئی اور بھی شامل کرتے ہیں۔	صرف بپتسمہ اور عشائے ربانی کے قائل ہیں۔	سات بنیادی سیکریمنٹس کے قائل ہیں۔
پادری بننے کی اہلیت	صرف مرد اور وہ خواتین بن سکتی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی خیراتی کاموں کے لیے وقف کر دی ہو۔	بلاکسی شرط کے عورتوں کے پادری بننے کے قائل ہیں۔ تاہم اس میں بعض لوگ اختلاف رائے رکھتے ہیں۔	پادری کا مرد اور کنوارہ ہونا ضروری ہے۔ (بعض لوگ شادی کے قائل ہیں۔)

اسائن منٹس

1. عیسائیت کے بنیادی عقائد کا ایک چارٹ بنائیے نیز اس میں ان عقائد کے مقابل اسلامی عقائد کو واضح کیجیے۔
2. مستقبل میں آنے والے نجات دہندہ کا تصور عیسائیت کے علاوہ اور کون سے مذاہب میں ہیں؟ انٹرنیٹ پر اس کے متعلق معلومات سرچ کیجیے۔
3. اسلام، یہودیت اور عیسائیت کے مشترکہ عقائد کیا ہیں؟

باب 3: ہندومت

تعداد کے اعتبار سے عیسائیت اور اسلام کے بعد ہندومت دنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہے اور کروڑوں افراد اس مذہب کے پیرو ہیں۔ مورخین کے مطابق لفظ ہندو، سندھو سے بنا ہے جو دریائے سندھ کا نام ہے۔ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں ہمیں اس دریا کا نام کئی جگہ ملتا ہے۔ ویدک اور ہندو دھرم کے علاوہ عام طور پہ یہ سناتن دھرم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سناتن سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ سدا سے سیدھا چلا آیا ہوا۔ دھرم کے معنی میں لغت نویس ضابطہٗ حیات، مذہب، فرض اور طبعی فطرت (Physical Nature)" بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً آگ کا دھرم جلانا ہے۔ اس محدود تناظر میں انگریزی میں دھرم کا ترجمہ ہم فرض یا Duty بھی کر سکتے ہیں۔ یہ لفظ ہمیں ہندوؤں کی سبھی مقدس کتابوں میں کثرت سے ملتا ہے۔

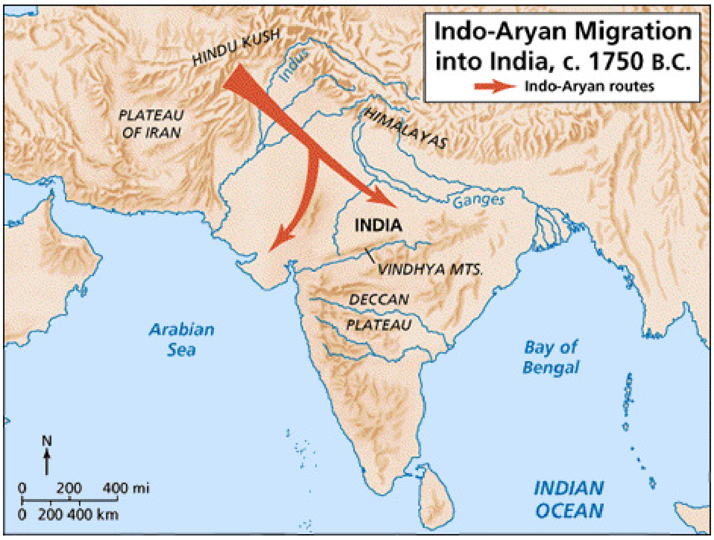
ہندومت کی تاریخ

مذاہب عالم کا مطالعہ کرنے والوں اور خود اہل ہنود کے لیے یہ متعین کرنا بہت مشکل رہا ہے کہ ان کے مذہب کی بنیاد کب اور کس نے ڈالی؟ لیکن چونکہ ہندوستان میں کسی بھی امر کی قدامت اس کی عظمت کی دلیل مانی جاتی ہے لہٰذا اس مذہب کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا مذہب دنیا کا سب سے قدیم مذہب ہے جو تاریخ و زمانے سے ماوراء ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ہے جس کی بنا پر یہ وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ فلاں دور میں ہندومت کا آغاز ہوا۔ اس مذہب کی بعض کڑیاں زمانہ قدیم سے ملتی ہیں لیکن اکثر مورخین اس خیال کو ترجیح دیتے ہیں کہ ہندومت کا آغاز اس دور میں ہوا جب وسط ایشیائی قوم آریا نے ہندوستان پر حملہ کیا، تاہم اس بات پر بھی مورخین متفق نہیں ہیں کہ آریا ہندوستان میں کب آئے، عام طور پر اس کا اندازہ 2000-1500BC کا لگایا جاتا ہے۔ لیکن ہندومت کی مذہبی روایات اسے اپنی تاریخ کو اس سے بھی بہت زیادہ پیچھے کی طرف لے جانے کی گنجائش رکھتی ہے۔

قدیم دور (1500BC سے پہلے)

زمانہ ما قبل تاریخ میں ہندوستان کی تاریخ سے متعلق زیادہ معلومات ہمارے پاس نہیں ہیں البتہ اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں سیاہ فام دراوڑ نسل کے لوگ آباد تھے، ان سب سے اہم تہذیب وادئ سندھ کی تہذیب ہے جس میں موہن جو داڑو اور ہڑپہ شامل ہے۔ یہ تہذیب اپنے دور کے اعتبار سے انتہائی ترقی یافتہ تھی۔ یہ لوگ موجودہ دور کی طرح پر آسائش اور اعلیٰ طرز کی

زندگی گزارتے تھے۔ گھروں میں غسل خانے، کنویں، نالے، سیدھی اور وسیع سڑکیں، پتھروں اور سونے چاندی کے خوبصورت زیورات، اوزار، سکّے اور دوپہیوں والی گاڑی اس تہذیب کی عظمت کی آج بھی گواہی دے رہے ہیں۔ ہمیں ان کے مذہبی حالت مکمل معلوم نہیں ہوسکی ہے تاہم شواہد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان میں توحید پرستی اور مظاہر پرستی دونوں ہی موجود تھی۔ بعد یہ تہذیب کس طرح صفحہ ہستی سے مٹ گئی، اس بارے میں کوئی ٹھوس شواہد نہیں ہے، اس بارے میں سیلاب، طوفان اور دیگر قدرتی سے لے کر بیرونی حملے تک کے قیاس کیے جاتے ہیں، لیکن حتمی بات کہنا فی الحال ممکن نظر نہیں آتا۔



http://bhoffert.faculty.noctrl.edu/REL315/01.VedicFoundations.html

آریائی قوم کی ہجرت

برہمنی دور (900-600BC)

ویدی عہد کا آخری دور، یعنی آریوں کے دریائے گنگا اور جمنا میں آباد ہونے کا دور، برہمنا عہد کہلاتا ہے۔ یہ دور ہندوؤں کی مقدس کتاب ویدکی ہی تعلیمات پر مبنی، دینیات کی ان کتابوں سے منسوب ہے جس کا عرصہ ہندوستان میں آریوں کے فتوحات کے بعد یعنی 900BC سے لے کر 600BC تک رہا۔ اس عہد تک آریا اور ہندوستان کی مقامی مذہبی روایات آپس میں مل چکی تھیں۔ آریائی قوم میں اپنی عادات و اطوار کے کچھ باقیات موجود تھے جو دراوڑھ نے بھی اپنا لیے تھے۔ اسی طرح آریوں نے بھی قدیم ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ہی ان کے دیوتا بھی اپنا لیے تھے۔ اس دور میں مذہبی رسومات پیچیدہ ہوتی جارہیں تھیں اور ان پر ایک خاص طبقے (برہمن) کی اجارہ داری قائم ہوگئی تھی جن کے بارے میں یہ تاثر عام ہو گیا تھا کہ وہ تمام لوگوں سے افضل اور ممتاز قرار دے دیا تھا۔ مخصوص مہارت حاصل کرنے کے رحجان کے نتیجے میں پیشے موروثی ہوچکے تھے اور پیشوں کے لحاظ سے طبقاتی نظام رائج ہوچکا تھا۔ مذہبی پیشوا برہمن

کہلانے لگے ، جنگ کرنے والے اور ملک کے سیاسی معاملات کو سنبھالنے والے چھتری (کھشتری یا کھتری) کہلائے اور زراعت و تجارت سے وابستہ لوگ ویش کہلائے۔ مقامی قوم یعنی دراوڑ (داس) شودر کہلائے۔ ابتداء میں اس طبقاتی نظام میں کوئی کٹر پن نہیں تھا بلکہ ان میں باہم رشتے وغیرہ ہوتے رہتے تھے۔ لیکن بعد کے کسی نامعلوم زمانے میں ایک مخصوص مذہبی طبقے کی طرف سے طبقاتی نظام کو مذہبی حیثیت دے دی گئی اور ازروئے قانون ذاتیں آپس میں نہ شادی کر سکتی تھیں اور نہ ہی نہ ایک نشست میں بیٹھ سکتی تھیں۔ اس کے بعد یہ نظام جامد اور غیر لچکدار ہوتا چلا گیا اور اس نے اعلیٰ سمجھی جانے والی ذاتوں کی جانب سے نچلی سمجھے جانے والی ذاتوں کے لوگوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی۔

چونکہ عبادت کے لیے مذہبی راہنما کا ہونا ضروری تھا اور اسی کی نگرانی میں عبادت کی جانے لگی تھی، اس وجہ سے عام لوگ اپنی قدیم دعاؤں کو بھول چکے تھے۔ اگرچہ کثرت پرستی اب بھی برقرار تھی لیکن ویدوں کی تشریحات اور سنسکرت زبان کی ترتیب کی وجہ سے مذہب میں کئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اس دور کے آخر میں اندازاً 500BC میں ویدوں کی تفہیم کے لیے نئے علوم رائج ہوئے۔ ان میں اہم دھرم سوتر، شاستر (قوانین) سنسکرت گرامر، نجوم، عروض اور مذہبی رسوم پر مبنی کتابیں تھیں جس پر موجودہ ہندومت کی تعمیر ہوئی۔ کئی لوگوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ ان کا مذہب کرپٹ مذہبی رہنماؤں کی بدولت اب صرف طبقاتی نظام اور گاؤ پوجا تک ہی محدود رہ گیا ہے، اسی احساس اور اضطراب کی وجہ سے لوگ جنگل میں گوشہ نشین ہونے لگے اور وہاں غور خوض میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے فلسفیانہ غور و فکر کیا اور گیان (معرفت) کے ذریعے نجات کی راہ تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ گوشہ نشینی کی یہی روایت آگے جا کر بدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب کا باقاعدہ آغاز ثابت ہوئی۔ جنہوں نے ہندوؤں کے مذہب کو ایک نئی جہت پر روانہ کر دیا۔[1]

بدھ مت اور جین مت (500BC-800BC)

پانچویں صدی قبل مسیح میں بدھ مت کے بانی گوتم بدھ، اور ہندی مذہب جین مت کے بانی مہاویر پیدا ہوئے۔ ان مذاہب کے مذہبی عقائد کے مطابق ان کا مذہب ان دو شخصیات سے پہلے بھی موجود تھا، جس میں کئی مقدس ہستیاں گزری، لیکن تاریخ میں ان دونوں کی علیحدہ شناخت انہی سے ہوتی ہے۔ گوتم بدھ اور مہاویر نہ صرف ہمعصر تھے بلکہ ان دونوں کی سیرت میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں کے ہی مسلک ہندو دھرم کی مروجہ خامیوں کو دور کرنے کے لیے رائج ہوئے تھے۔ ان مذاہب نے ابتداء میں ذات پات کی

[1] See: chaper 4. Rama Shankar Tirpathi. History of Ancient India. Delhi: Motilal Banarsidas publisher (1942) First Edition

شدید مخالفت کی جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگ ان مذاہب کو قبول کرنے لگے۔ لیکن ان مذاہب خدا اور عقیدہ بعد الموت کے متعلق واضح بیانات نہیں تھے۔ان کی تعلیم کا خاص محور اخلاقیات اور رہبانیت کا کی تبلیغ تھا۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے نظری رجحانات کے بجائے یہ ایک عملی فلسفہ تھا، جس کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے تھا۔ دونوں مذاہب کسی دیوتا یا خدا کے عقیدت مندی سے دور اور علم و عمل، اعلیٰ خلقی کا حصول کے لیے کوشاں تھے۔

سری لنکا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، نیپال، چین اور جاپان میں بدھ مذہب وہاں کی سابقہ روایتوں سے مماثلت کے باعث تیزی سے پھیلتا گیا اور اپنی مکمل نشونما کے بعد یہ مذہب ہندوستان آیا۔ ہندوستان چونکہ اس وقت کئی معاشرتی بیماریوں کا مرقع بنا ہوا تھا اور یہ مذہب بہت سی معاشرتی برائیوں سے پاک تھا، اس کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا تھا، اس وجہ سے بہت ہی کم عرصے میں برق رفتاری سے یہ مذہب ہندوستان میں پھیل گیا۔ ہندوستان میں یہ مذہب اپنی امتیازی خصوصیات کے باعث خوب پھیل رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس مذہب کو اشوک بادشاہ(304-232BC) کی سرپرستی حاصل ہوئی جس نے اس مذہب کی اشاعت کے لیے کئی مبلغ بھیجے اور ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی تعلیمات ستونوں اور کتبوں کے ذریعے عام کیں۔ اشوک کی ہی دعوتی تحریک پر بدھ مت مشرقی ممالک میں پھیلا۔

ایک طرف ہندوؤں کا راہبانہ طرز زندگی اختیار کیا ہوا وہ طبقہ تھا جو اپنشدی (فلسفیانہ) خیالات کا حامل تھا تو دوسری طرف ادنیٰ طبقے کے لوگ امتیازی رویے اور خود پر ہونے والے ظلم و جور سے کراہ رہے تھے۔ ایسے میں بدھ مت ان دونوں کے لیے ان کی پریشانیوں کا حل تھا۔ ہندو دھرم کو ماننے والوں کی بڑی تعداد اس میں شامل ہوتی رہی، لیکن اس اشاعت کے نتیجے میں بدھ مت میں ہندو مذہب کے بہت سے اثرات آ گئے۔

ہندوستان جو کہ مختلف قوموں اور مکاتب فکر کا مرکز تھا، اس نے ان نئے مذاہب کے ساتھ بھی عجیب سی مفاہمت کر لی اور بدھ مت اور جین مت کے ماننے والے اپنی سابقہ تعلیمات سے دور اور برہمنی مذہب کے قریب ہونے لگے۔ بدھ اور جین مت نے ہندوستان کے برہمنی مت سے چند باتوں کو چھوڑ کر کافی کچھ مستعار لیا۔ کرم اور آواگوان ان مذاہب میں برہمنی مت ہی سے آیا ہے۔ چونکہ بدھ مذہب میں دیوتا پرستی کو کوئی خاص پہلو نہ تھا اس لیے مذہبی اعتبار سے اس خلا کو پر کرنے ان مذاہب والوں نے ہندوستان کی مقامی روایت کی پیروی کرتے ہوئے مہاویر اور بدھ کے مجسمے بنائے گئے اور ان کی پرستش کی جانے لگی۔ آخر کار یہ دونوں مذاہب ہندوستان کے مقامی مذہب ہندو مت میں ضم ہو گئے۔ ان کی حیثیت اگرچہ ایک جدا فرقے کی باقی تھی لیکن ان کی تعلیمات زیادہ تر ہندو مت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ بدھ مت اگرچہ اپنی اصلی صورت میں ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن اس تہذیب سے شدید متاثر ہوا۔

ہندو، بدھ اور جین مت کا انضمام (Fusion)

اس وقت ہندو مت کی جو صورت ہمارے سامنے ہے اس کی بنیاد 300CE سے لے کر 700CE تک کے دور میں ڈالی گئی۔ اس دور میں ہندوستان میں مصوری، مجسمہ سازی، فن تعمیر اپنی انتہاء کو پہنچ چکی تھی۔ ہند کی تہذیب کو ماضی کے ادوار کی طرح اس دور میں بھی کئی غیر قوموں کی روایات سے واسطہ پڑا۔ کئی غیر ملکی حملہ آور، اپنی تہذیب کے ساتھ یہاں آئے۔ لیکن اس تہذیب نے تمام نسلوں کے لوگوں کی روایات اور ان کے عقائد کو اپنی آغوش میں لے لیا اور یہ تہذیب متعدد تہذیبوں کا مجموعہ بن گئی۔ اس طرح مختلف قوموں کی باہم میل جول اور مذہبی و تمدنی تصادم سے دوسری صدی عیسوی کے لگ بھگ قدیم ہندوستانی مذہب اور تہذیب زوال پذیر ہو رہی تھیں اور ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اشوک کی خدمات کی بدولت بدھ مت عوام میں مقبول ہو چکا تھا۔ جین مت اگرچہ الگ فرقہ تھا لیکن برہمنی مت سے زیادہ دور نہیں تھا اور نہ ہی اس کے اثرات ہندوستانی لوگوں پر راسخ ہوئے تھے۔ بدھ مت نے ہندوستان میں ایک متاثر کن حیثیت حاصل کر لی تھی۔ سارے ہندوستان حتیٰ کہ ایران تک بدھ مت کی تعلیمات پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ ہندو علماء نے بدھ مت کی بیخ کنی کے لیے کئی اپنی کوششیں شروع کر دیں، ویدوں کی تدوین نو کی گئی، بدھ مت کے خلاف کئی ایک کتابیں لکھی گئیں۔ مہابھارت اور رامائن رزمیہ بھی اسی دور میں ترتیب دی گئیں تاکہ عوام کے سامنے دیوتاؤں کے کارنامے خوبصورت انداز میں پیش کیے جا سکیں اور انہیں اپنے قدیم ہندو مذہب کی طرف دوبارہ مائل کیا جا سکے۔

آٹھویں صدی عیسوی تک بدھ مت ہندوستان کے چپے چپے میں پھیل چکا تھا۔ لیکن ہندو مت کی از سر نو تعمیر اور تشدد کی وجہ سے بدھ مت کے ماننے والے ہندوستان چھوڑ گئے اور اکثریت نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا۔ یوں بدھ مت ہندوستان سے باہر کر دیا گیا لیکن بدھ تہذیب کے جو اثرات ہندو دھرم پر مرتب ہوئے انہیں زائل کرنا کسی کے بس کا کام نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی صورت کافی تبدیل شدہ تھی لیکن مسلمانوں کی آمد تک بدھ مت سندھ میں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ ایک عرصے بعد برہمنیت نے بدھ مت کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے گوتم بدھ کو اپنے اوتاروں میں شامل کر لیا تھا اور برہمنیت اور بدھ مت نے مل کر ایک ہی مذہب کی شکل اختیار کر لی۔

ہندو مت مسلم دور میں (700-1700CE)

عرب اور ہندوستان کے باہم قدیم تجارتی تعلقات اسلام کی آمد کے بعد بھی قائم تھے۔ عرب اور ایرانی تاجر یہاں تجارت کی غرض سے آتے رہتے تھے۔ مورخین کے مطابق عرب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بھی اہل ہند کو بخوبی علم تھا۔ لیکن اسلام سے شناسا ہونے کے باوجود یہاں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر رسوخ نہ تھا۔ یہاں کوئی باقاعدہ اسلامی سلطنت نہیں تھی۔ اس عظیم خطے میں سب سے پہلے مسلمان فاتح محمد بن قاسم تھے۔ جنہوں نے سن 712CE میں سندھ فتح کیا اور ایک اسلامی ریاست قائم کی۔ یہ ریاست

موجودہ پاکستان کے جنوب اور وسط تک محیط تھی جو پہلے بنو امیہ اور بعد ازاں بنو عباس کے اقتدار کے تحت قائم رہی۔ یہ باقاعدہ طور پر پہلا موقع تھا جب ہندوستان کو اسلامی اثرات سے واسطہ پڑا۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی(971-1030 CE) نے ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب فتح کر کے اپنی سلطنت قائم کی۔اس کے بعد محمد غوری(1202–1206) اور پھر مغلیہ دور حکومت سے لے کر 1857CE کی جنگ آزادی تک ہندوستان کے وسیع رقبے پر مسلمانوں کی حکومت کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی۔

مغربی مورخین ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور میں "ہندوستان کی تباہی" کا دور قرار دیتے ہیں۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ مغل سلطنت میں ہندوؤں کے ساتھ انتہائی اچھے تعلقات رہے۔ تاہم اورنگزیب(r. 1656–1707) کے دور میں یہ تعلقات اچھے نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے دور میں اورنگزیب نے کئی مندروں کو مسمار کروادیا۔ ممکن ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہو کہ اورنگزیب نے اپنے لقب "محی الدین" کی حیثیت سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی رسومات مثلاً مندروں میں ہونے والے خاص برہنہ رقص اور ستی کی رسم بھی جبراً ختم کروادی تھی اور بعض مندروں کے خزانوں کو ہندو عوام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اورنگزیب کی فوج اور سول ایڈمنسٹریشن میں بہت سے ہندوؤں کا ذکر ملتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی تک ہندو دھرم بھی کئی نشیب و فراز سے گزرا۔ اس مذہب میں آج جو اہم مذہبی کتابیں مانی جاتی ہیں وہ سبھی اسی دور میں لکھی گئی۔ اس سے پہلے مذہبی کتابیں سینہ بسینہ روایت ہوتی تھی۔ اس دور کے قابل ذکر عالم و فلسفی شنکر اچاریہ (788-820CE) تھے جن کی حیثیت ہندوؤں کے ہاں ریفارمر کی ہے۔ شنکر اچاریہ نے ہندوؤں کی کئی اہم کتابوں کی بھاشیہ (تفاسیر) لکھیں اور ہندو فلسفے پر بھی گراں قدر سرمایہ چھوڑا۔ بدھ مت کے رد کے لیے اس دور میں اور بھی کئی کتابیں لکھی گئیں جس کی بدولت ہندوؤں کے ہاں فلسفہ اپنی انتہائے کمال کو پہنچا۔ شنکر اچاریہ کے علاوہ بھی کئی ایسے فرقے اس دور میں ظاہر ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں ہندومت کی تشریح کی اور اپنے فرقے کے اصول اور رسوم و شعائر متعین کیے۔ گذشتہ دور کی طرح اس دور میں بھی پران اور مہابھارت کے کرداروں کو نمایاں کیا گیا جس کی سب سے اہم مثال شری کرشن کی سیرت پر مبنی مفصل کتاب "بھگوت پران" ہے جو اسی دور کی یادگار ہے۔ قدیم ویدک دھرم میں جو رسومات مثلاً قربانی وغیرہ تھیں اسے اس زمانے میں انتہائی محدود کر دیا گیا۔ اس ابھرتے ہوئے ہندومت کی سب سے اہم خوبی مختلف افکار و عقائد کو سمو لینے کی صلاحیت تھی۔

مسلمانوں کے دور میں ہندوستان کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی نظام کے ساتھ ساتھ مذہب پر بھی اسلام کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جس کی بدولت ہندومت میں بہت سے ہادی اور اصلاحی تحریکوں کا ظہور ہوا۔ ان اصلاح پسندوں اور دیگر مذاہب کے اثرات سے ایسے مکاتب فکر وجود میں آئے جنہوں نے ہندومت میں توحید کا پرچار کیا اور بت پرستی کی مخالفت کیں۔ مشہور فلسفی رامانج (1017-

(1137CE) اور راماننډ(1299-1410) بھی انہی میں سے ایک تھے۔ ہندو دھرم نے اپنی طبعی روایت قائم رکھتے ہوئے تمام اختلافات قبول کیے اور سبھی مکاتب فکر کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ مذہبی اصلاح کی سبھی کوششیں شہری طبقے میں ذات پات کی شدت میں کمی کے علاوہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اگرچہ ان مصلحین کے علمی سرمائے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن وہ کوششیں جو انہوں نے توحید قائم کرنے کے لیے عمل میں لائیں زیادہ کارگر نہ رہیں۔

برصغیر کی مذہبی اور سماجی تاریخ میں صوفیا کا ذکر کیے بغیر کوئی مورخ بھی تاریخ رقم نہیں کر سکتا، کیونکہ برصغیر میں اسلام کی تدوین و اشاعت میں اہم کردار صوفیا کا ہی رہا ہے۔ جن کی تعلیمات کی اساس رواداری، برداشت، محبت اور عدم تشدد پر استوار رہی ہے۔ ان صوفیاء کرام میں مشہور نام شاہ عبد الطیف بھٹائی، خواجہ معین الدین چشتی، فرید الدین، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور سلطان باہو شامل ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاں صوفی ازم کے فروغ کے بعد ہندوؤں کے ہاں بھی بھگتی تحریک شروع ہوئی ۔ بھگتی سنتوں (صوفیوں) نے تمام مذاہب کو برحق قرار دیتے ہوئے یہ تعلیم دی کہ ایک شخص کا تعلق چاہے کسی بھی مذہب سے ہو اور ریاضت کے ذریعے خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ ان کے نزیک اسلام اور ہندو دھرم میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ ایک ہی منزل کے دو مختلف راستے تھے۔ اکبر بادشاہ(r.1556-1605) کا پیش کردہ "دین الٰہی" بھی اسی رجحان کا ایک مظہر تھا جس کے مطابق تمام مذاہب حق ہیں۔

سکھ مت

انہی مکاتب میں سے ایک پندرہویں صدی عیسوی میں نمودار ہونے والا فرقہ سکھ مت تھا جو اپنی ابتداء میں کوئی علیحدہ مذہب نہیں بلکہ ہندومت اور اسلام سے متاثر ایک ذیلی تحریک تھی۔ اس فرقے کے بانی گرونانک تھے۔ گرونانک کے پیدائش سن 1466CE میں لاہور کے قریب تحصیل شرقپور کے ایک گاؤں تلونڈی (ننکانہ صاحب) میں ہوئی۔ ان کا تعلق ایک کھشتری خاندان سے تھا۔ اپنی ذہانت کے سبب انہوں نے محض نو برس کی عمر میں عربی، فارسی اور ہندوستان کی دیگر دیسی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ بچپن سے ہی ان کا مذہبی رجحان بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض سیرت نگاروں کے مطابق جوانی میں انہوں نے شیخ اسماعیل بخاری، سید علی ہجویری، بابا فرید اور پنجاب کے دیگر مشہور مسلمان صوفیائے کرام سے اپنی روحانی پیاس بجھائی۔ تیس سال کی عمر میں وہ گرو بن گئے اور ان کا انتقال 1539CE میں ہوا۔

نانک صاحب اوہام پسندی، ذات پات اور بت پرستی کے شدید مخالف تھے انہوں نے زندگی بھر اپنے شاگردوں، یعنی سکھوں کو عدم تشدد، توحید و مساوات کی ہی تعلیم دی۔ لیکن بعد میں سکھ گروؤں کا جو سلسلہ چلا؛ ہمیں اس کی تعلیمات اور اس تحریک کے بانی کی تعلیمات میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ اپنی ابتداء میں یہ مسلک اسلام سے قریب تر تھا اور بہت سے مسلمان نانک کو پکا مسلمان سمجھتے تھے

لیکن بعد ازاں اس تحریک میں ہندوانہ رنگ نمایاں ہوتا گیا اور یہ مسلک اسلام اور ہندوؤں کے مذہب کا مرکب بن گیا میں ہندوانہ عنصر زیادہ نمایاں رہا۔

سکھ مت میں اگرچہ اسلامی توحید اور مساوات کی تعلیم رائج ہو چکی تھی لیکن ہندوؤں کے عقیدہ نروان بھی اس میں شامل ہو گیا۔ عدم تشدد کے فلسفے کو سکھ مت میں بنیادی اہمیت دی گئی تھی لیکن پانچویں گرو نے سکھ مت کی اشاعت کے لیے قوت کا استعمال کیا اور اپنے پیروکاروں کی فوج تیار کر کے مغلوں سے باقاعدہ جنگ کی اور سولہ سال کی کوشش کے بعد ایک آزاد حکومت قائم کی۔

ہندومت، انگریزوں کے دور میں (1700-1950CE)

سولہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ برطانیہ سے انگریز تجارت کی غرض سے برصغیر آئے اور مغلیہ سلطنت سے بعض مراعات حاصل کر کے مختلف شہروں میں اپنے مراکز قائم کر لیے۔ یہ دور مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ سترہویں صدی میں مسلمانوں کے زوال کو دیکھتے ہوئے یہاں انگریز سیاسی طور پر بھی سرگرم ہو گئے اور بنگال جو اس وقت فرنسیسیوں کے ہاتھ میں تھا، انہیں شکست دے کر یہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد مسلسل یکے بعد دیگرے تمام صوبوں پر ان کا قبضہ ہوتا رہا اور اس اقتدار کی توسیع ہوتی رہی حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک برصغیر کے مختلف راجاؤں، نوابوں اور حکمرانوں سے معرکہ آرائیوں کے بعد ان کا تسلط تقریباً پورے برصغیر پر قائم ہو گیا۔ انگریزوں کے دور میں عیسائی مبلغین بھرپور انداز میں اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، ساتھ ہی برصغیر کے ہنود بھی مغربی مفکرین کے افکار سے متعارف ہوئے۔ ذات پات کے نظام سے بیزاری کی وجہ سے کئی ہندو عیسائیت قبول کر چکے تھے، عیسائی مبلغین کے جواب میں ہندوؤں کی جانب سے بھی کئی اہم مبلغین اٹھے جنھوں نے عیسائی مبلغین کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دیا اور ہندوؤں کو دوبارہ ان کے قدیم مذہب کی طرف مائل کیا۔ راجہ رام موہن رائے (1774-1833)، سوامی دیانند سرسوتی (1824-1883) اور مہاتما گاندھی (1869-1948) جیسے کئی مذہبی اور سماجی مصلحین نے اس دور میں عیسائی مبلغین کا مقابلہ کیا اور ہندوؤں میں عدم تشدد اور قومیت کے تصور کو ابھارا۔ اس دور میں نہ صرف سماج کی اصلاح کے لیے کوششیں کی گئیں بلکہ ہندومت کو نئی بنیادوں پر استوار کرتے ہوئے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں اپنے مذہب اور ثقافت سے افتخار کا جذبہ بھی پیدا کیا گیا جو انگریزوں کے عیسائی مبلغین کی وجہ سے متزلزل ہو گیا تھا۔ اس کوشش میں سب سے زیادہ اہم کوششیں سوامی دیانند سرسوتی اور ان کے معتقدین کی تھی۔ سوامی دیانند سرسوتی نے آریا سماج کی بنیاد ڈالی جو بہت ہی کم عرصے میں ہندوستان کی ایک اہم تحریک بن گئی۔ سوامی جی نے ویدوں کی نئی شروحات لکھیں اور ہندومت میں ذات پات اور بت پرستی کا انکار کرتے ہوئے عقیدہ توحید کو رائج کیا۔ اس ضمن میں سب سے اہم کوششیں وہ تھیں جس میں سوامی جی اور ان کے معتقدین نے اپنے مذہب کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور ہندومت کو اُس صورت میں

پیش کیا جو سائنس سے بالکل ہم آہنگ بلکہ بعض اوقات سائنس سے ایک قدم آگے نظر آنے لگا۔ اگرچہ ماضی کے مصلحین کی طرح توحید اور بت پرستی کے خلاف ان کی کوششیں زیادہ کارگر نہ رہی اور عوام اور مذہبی علماء کی ایک بڑی تعداد نے ان کی مخالفت بھی کی لیکن انہوں نے ذات پات، قربانی کی رسم اور دیگر شعائر کی جو جدید تشریحات پیش کیں انہیں بالعموم تسلیم کیا گیا۔ اس معاملے میں دور جدید میں سب انہی کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔

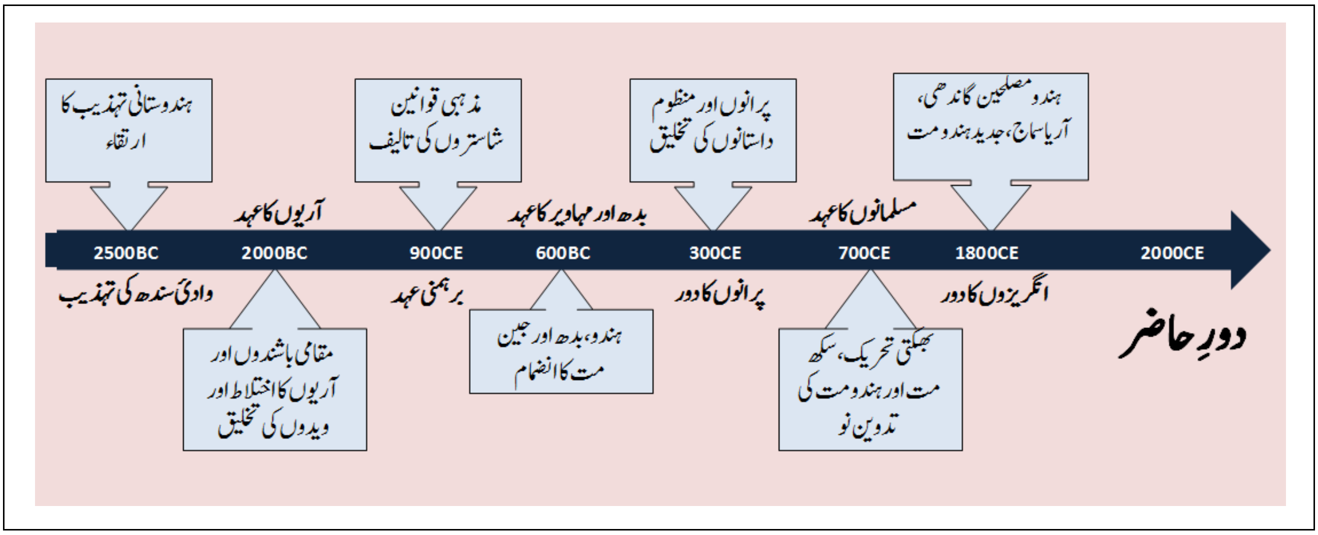
جدید ہندو مذہب (1950 کے بعد)

1947 میں برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان علیحدہ ملک کے طور پر وجود میں آئے۔ بھارت آزادی کے بعد سیکولرزم کی راہ پر گامزن ہوا لیکن اس دور میں ہندومت کو دنیا کے سامنے جس قدر سائنٹفک اور نفیس انداز میں پیش کرنے کا رجحان قائم ہوا اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ ہندو علماء اس سے پہلے بھی مغرب میں اپنی مذہبی سرگرمیاں شروع کر چکے تھے لیکن آزادی کے بعد ان سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوا اور کئی ایسے ادارے تشکیل دیے گئے جس کا مقصد خاص مغرب میں ہندو مذہب کی تبلیغ تھا۔ اس مقصد کے لیے انگریزی میں اس مذہب سے متعلق ایک بڑا علمی ذخیرہ تشکیل دیا جانے لگا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ نیز اس کے ساتھ ہی بھارت میں اس مذہب کی قدیم زبان سنسکرت کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی اور اس زبان کے فروغ کے لیے کئی ادارے قائم کیے گئے۔ ہندی زبان جو مذہبی ادب کی اہم ترین زبان تھی اسے بھی سرکاری زبان بنایا گیا۔ اس زبان میں عربی و فارسی کا اچھا خاصا ذخیرہ اثر شامل تھا، کہیں کہیں سنسکرت سے ماخوذ شدہ ہندی کے الفاظ بھی آجایا کرتے تھے لیکن سرکاری زبان بننے کے بعد اس میں اُردو اثر کو زائل کر کے سنسکرت الفاظ کی بھرمار کی گئی۔ اس مذہب کی تعلیم اور احساس تفاخر کو اجاگر کرنے کے لیے ٹی وی کیبل کا بھی موثر استعمال کیا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کاوش "مہابھارت" سیریل تھا جس میں اس داستان کو انتہائی جدید اور مرتب طریقے سے پیش کیا گیا۔ یہ سب کچھ اسی مقصد کے تحت تھا کہ ہندوؤں کا ان کی قدیم تہذیب و تمدن سے رشتہ دوبارہ استوار کیا جائے۔

ان سبھی عوامل جس کا ہم نے جائزہ لیا ان کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ ہندو دھرم کوئی ایک خاص فلسفہ، نظام زندگی یا دستور العمل نہیں بلکہ یہ متعدد خیالات و نظریات کا ایسا منفرد مجموعہ ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ آج اس مذہب میں اس قدر لچک موجود ہے کہ ایک فرقہ تین خداؤں کا مانتا ہے تو دوسرا تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو۔ حتیٰ کہ خدا کے انکار کرنے والے بھی اس مذہب کا حصہ ہیں۔ ایک شخص مادہ کے ازلی ہونے کا قائل ہے تو دوسرا منکر! تناسخ اور کرم کے علاوہ شاید ہی کوئی امر ہو کہ جس پر تمام ہندو متفق ہوں۔ مختلف خطوں کے مختلف رسوم و شعائر ہیں۔ یہ دھرم ہر قسم کے عقیدے کو اپنانے کے لئے ہمیشہ سے تیار رہا ہے۔ تمام رسم و رواج خواہ وہ قدیم زمانے کے ہوں یا عصر جدید کے، سب کو اختیار کر لیتا ہے۔

ہندومت، مذہب کی بابت اس آزادی کا نام ہے جس کی رو سے ہر کوئی شخص کوئی بھی عقیدہ یا رسم اپنا سکتا ہے۔ یہ مذہب خدا کے مختلف تصورات میں سے کسی ایک تصور کو حق یا باطل قرار نہیں دیتا اور نہ کسی ایک تصور کو کل بنی نوع انسان کے لئے قطعی معیار تسلیم کرتا ہے۔ ہر شخص کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جو تصور اور طریقہ عبادت اس کو پسند آئے وہ اسی کو اختیار کرے۔ بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تناسخ کو نہیں مانتے، تو کچھ لوگ گائے کے تقدس کو اہمیت نہیں دیتے، کچھ ذات پات کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کچھ مقدس کتابوں پر تنقید کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس ساری صورتحال کو جاننے کے بعد صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہندو دھرم دراصل مذہب اور عقائد کے معاملے میں آزادی کا نام ہے لہٰذا ہندومت کی طرح ہندو کی تعریف کو بھی کسی مذہب یا عقیدے میں قید کرنا اس دھرم کی شان کے منافی ہے۔

ہندو مذہب کی تاریخ کو ہم اس ٹائم لائن کی شکل میں بیان کر سکتے ہیں:



مقدس کتابیں

ہندو دھرم ایک کثیر ادبی سرمائے کا حامل ہے جو تقریباً 4000BC سے لے کر سے 600CE تک محیط ہے۔ ان میں زیادہ تر سنسکرت زبان میں ہیں، جن میں قدیم آریائی، دراوڑی اور زرتشتی رنگ ملتا ہے۔ یہ مذہبی ادبیات ہزاروں سال تک مختلف برہمنوں کے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ ہندو مذہب کی سبھی کتب بنیادی طور پر دو قسموں میں تقسیم کی جاتی ہیں: شروتی اور سمرتی۔ شروتی سے مراد وہ تحریریں ہیں جو سنی گئی ہیں یا نازل کی گئی ہیں جبکہ سمرتی سے مراد وہ تحریریں ہیں جو یاد کی گئیں۔ شروتی کو الہامی نوعیت کی کتابیں سمجھا جاتا ہے۔ ان کتابوں کو مجموعی طور پر دھرم شاستر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتابیں ہندو دھرم کے قانون، رسوم ورواج، تاریخ اور روایات پر مبنی ہیں اور انتہائی تقدس کی حامل ہیں۔ ان سمرتی کتابوں میں منو دھرم شاستر، پران، گیتا، رامائن، اور مہابھارت شامل ہیں۔

وید

لفظ وید کا مطلب ہے جاننا۔ سنسکرت زبان میں موجود وید دنیا کا وہ قدیم ترین مذہبی صحیفہ ہے جو تقریباً دو ہزار سال کے عرصے میں ہندوؤں نے جمع کیا۔ مورخین کی رائے ہے کہ وید کی ابتدا 2000BC سے ہوئی ہے اور یہ تقریباً 1000BC تک مکمل ہوئے اور اس کے کئی زمانے بعد یہ معرض تحریر میں لائے گئے۔

وید کی قدیم تعداد میں ہندو علماء کا شدید اختلاف ہے۔ البتہ اس کی موجودہ مسلّمہ چار کتابیں ہیں: رگ وید، اتھر وید، سام وید اور یجر وید۔ باوجود کچھ تضادات و اختلافات کہ یہ چاروں وید انتہائی مستند مانی جاتی ہے کیونکہ ہندو دھرم کی بنیاد انہی وید پر ہے۔ ان چاروں ویدوں میں سب سے اہم اور مستند رگ وید ہے اور اس کے بعد اتھر وید، پھر سام وید اور پھر یجر وید کا نمبر ہے۔ بقیہ ویدوں کا زیادہ تر حصہ رگ وید سے نقل ہے۔ اس وید میں دیوتاؤں کی حمد و ثناء اور مختلف قسم کی دعائیں ملتی ہیں۔ اسی طرح یجر وید میں قربانی اور رسوم میں پڑھے جانے والے منتر، سام وید میں گیت اور اتھر وید میں زیادہ تر جادو وغیرہ کی تعلیم ملتی ہے۔ البتہ ان میں کئی مقامات پر موضوع سے ہٹ کر منتر بھی مل جاتے ہیں۔

ویدں کے رشی

ویدوں کے لکھنے والے شاعر رشی کہلاتے ہیں۔ رشی کے معنی ہیں منتر دیکھنے والا۔ دیکھنے سے ہندوؤں کا مراد الہام یا دل میں دیکھنا ہے۔ رشی منتر کا متکلم ہوتا ہے جو اپنی شاعری میں دیوتا سے کلام کرتا ہے۔ ہندو علماء کی اکثریت کا خیال ہے کہ وید مختلف زمانوں میں مختلف شاعروں نے تصنیف کیے۔ قدیم روحانی شخصیتوں نے اپنے اعلیٰ روحانی مقامات کی بناء پر کائنات کی سچائیوں کو سن لیا تھا اور پھر انہی نے اسے الفاظوں کا جامہ پہنایا۔ ان رشیوں میں آریائی، برہمنی اور قدیم ہندوستان کے دیگر مکاتبِ فکر کے لوگ شامل ہیں۔

وید کے مطالعے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف لوگوں کی زبان سے جاری ہونے والے سنسکرت اشعار کا مجموعہ ہے۔ البتہ ہندوؤں کے بعض فرقے وید کو ہزاروں رشیوں کا کلام نہیں مانتے۔ آریا سماج کا عقیدہ ہے کہ وید چار رشی اگنی، وایو، آدِتیہ اور انگرہ کو الہام ہوئے، اور رشی منتر کو تخلیق کرنے والے نہیں بلکہ اس کے معنی بیان کرنے والے ہیں۔[1]

اپنشد

ویدوں کے بعد ہندوؤں کے نزدیک اپنشد کا درجہ آتا ہے۔ یہ دراصل ان خطبات کا مجموعہ ہے جو ہندو گوشہ نشینوں نے جنگلوں میں اپنے

---

[1] سوامی دیانند سرسوتی۔ رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا۔ اردو ترجمہ نہال سنگھ۔ صفحہ 10 میرٹھ: مطبع وِدیا درپن (1898)

شاگردوں کو دیے۔ لیکن ہندوؤں کے ہاں اسے الہامی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اپنشد قدیم دانش کا ماخذ ہے، جس میں وید کی تشریح ایک منفرد اسلوب میں ملتی ہے۔ اپنشد کے اقتباسات کسی فلسفی بزرگ کے اقوال کی مشابہ لگتے ہیں۔ مورخین کے مطابق اپنشد کے خطبات 900-700BC کے دوران کسی عرصے میں مرتب ہوئے۔ وید کی طرح اپنشد کی تعداد میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ روایتی طور پر ان کی تعداد 108 بتائی جاتی ہے، البتہ غیر متنازعہ اپنشد کی تعداد 12 ہے۔

پُران

اپنشد کے بعد "پران" کا درجہ ہے اور اسے بھی وید کی طرح الہامی خیال کیا جاتا ہے۔ وید کی نسبت یہ بہت ہی مفصل اور آسانی سے سمجھ آنے والی کتاب ہے۔ اس میں کئی دیوتاؤں کی حکایات ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس میں ریاضی، فلکیات، تاریخ اور جغرافیہ کا علم بھی موجود ہے۔ پران کی تاریخ وید کے دور کی ہی بتائی جاتی ہے۔ کیونکہ وید اور پران دونوں میں ایک دوسرے کا ذکر ملتا ہے، مطالعے سے یہ غالب گمان ہوتا ہے کہ پران کا وجود وید سے پہلے تھا۔ پُرانوں کی تعداد اٹھارہ ہے اور ان میں تقریباً آٹھ لاکھ سے زیادہ اشعار ہیں۔ ان میں مشہور بھوشیہ پران، بھاگوت مہاتم پران، وشنو پران اور متسیہ پران ہیں۔ ان میں ہمیں کئی رشیوں کا خطاب ملتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ بات عموماً تسلیم کی جاتی ہے کہ یہ خود بھگوان کا کلام ہے اور مہارشی ویاس نے اس کلام کو صرف مرتب کیا تھا۔

منودھرم شاستر

منودھرم شاستر وہ قانون ہے جسے ہندو دھرم میں فقہ کا درجہ حاصل ہے۔ منودھرم شاستر میں ہندو دھرم کے مختلف رسوم و رواج اور قوانین وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں ہندو دھرم کی مقدس ترین کتاب منو شاستر اہم مقام رکھتی ہے، جو ہندو دھرم کا قانون مقدس ہے۔

ہندو دھرم کے علمِ معاشرت میں اس کتاب کا کثیر حصہ ہے۔ قوانین کے مجموعے کا درجہ رکھنے والی اس کتاب نے ہندوستانی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جو آج بھی ہندو معاشرے میں قائم و دائم ہیں۔ اکثر مورخین کے نزدیک اس منو سمرتی کی موجودہ صورت تقریباً دوسری صدی قبل مسیح میں وجود میں آئی۔ اسی نسبت سے یہ قانون منو کے نام سے معروف ہوئے۔ لیکن اس کے مصنف بارے میں تاریخی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مہابھارت

اگرچہ مہابھارت ویدک ادب میں شمار نہیں کی جاتی لیکن یہ ہندو متونِ مقدسہ میں سب سے طویل اور بلند مقام کتاب ہے۔ دو لاکھ پندرہ

ہزار اشعار پر مشتمل مہابھارت دنیائے ادب کی طویل ترین نظم ہے۔ یہ دراصل ہستناپور ریاست کے دو خاندانوں کورو اور پانڈؤں کے درمیان ہونے والی ایک بہت بڑی جنگ کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں میں جوئے کی بازی ہارے ہوئے پانچ پانڈو انتقام کے لیے 100 کورو اور ان کے ہزاروں ساتھیوں کے خلاف لڑتے ہیں اور بھگوان کے اوتار شری کرشن کی مدد سے پانڈو یہ جنگ جیت جاتے ہیں۔ مہابھارت کے مطابق اس جنگ میں ہندوستان کے تمام اضلاع کے سپاہیوں نے حصہ لیا تھا، ایک طرح سے اس جنگ نے ہندوستانیوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا ایک حق پرست یعنی پانڈوؤں کے حمایتی اور ایک باطل پرست یعنی کورو کے حمایتی۔ ایک گھمسان لڑائی کے بعد بالآخر جیت پاندوؤں کی ہوئی۔ بعض ہندو علما مثلاً موہن داس گاندھی، سوامی پرمانند اور سوامی اڑ گڑانند کے مطابق مہابھارت حقیقی جنگ کا نام نہیں بلکہ انسانی جسم (میدانِ عمل) میں نفس کے خلاف ہونے والی جنگ کا بیان جسے مہابھارت (بمع گیتا) میں تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر مورخین کا ماننا ہے کہ مہابھارت اصل تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔ مہابھارت نظم کو ویاس جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے، جنھوں نے اپنے شاگرد ویشم پائن کو اس کی تعلیم دی تھی۔ لہٰذا اس کی باقاعدہ ترتیب کا دور چھٹی صدی قبل مسیح کہا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ اس وقت تحریر میں نہیں لایا گیا تھا۔

بھگوَد گیتا

لفظ بھگ ود بھگ سے ہے جس کے معنی جاہ و جلال ہے۔ اور گیتا سے مراد نظم ہے۔ یہ کتاب مہابھارت ہی کا حصہ ہے۔ یہ وہ مکالمے ہیں جو قدیم ہندو مذہبی شخصیات، ارجن اور شری کرشن کے درمیان مہابھارت میں ہوئے اور ان میں شری کرشن نے ارجن کو بہت سی اخلاقی ہدایات دیں۔ یہ ہندوؤں میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ ویدک عہد کے بعد تصنیف ہونے کی وجہ سے گیتا اگرچہ الہامی نہیں مانی جاتی لیکن اپنے بہترین اسلوب، تعلیم اور مذہبی اہمیت کے باعث گیتا وید سے بھی کہیں بڑھ کر مقبول ہوئی ہے۔

عقائد

تصور خدا

ہندؤں میں خدا کو پکارنے کے لیے کئی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ بھگوان یا خدا سے مراد ہنود کے ہاں کوئی ایک متعین ہستی ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کا الگ الگ بھگوان یعنی خدا ہے۔ ہندومت میں ہر فرقے میں ان کے بھگوان یعنی خدا کے لیے جدا جدا تصورات قائم ہیں۔ ہمیں بیک وقت توحید کا مبہم تصور بھی ملتا ہے اور ہمہ اوست اور شرک کا بھی۔ ویدوں میں ہمیں دیوتاؤں کی کثرت ملتی ہیں۔ جن میں اگنی، سوتا، سوم، رڈر، وایو اندر اور بہت سے دیگر نام شامل ہیں۔ ہمیں ہندؤں کی مختلف کتابوں میں خدا کے متعلق مختلف

تصورات ملتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

1۔ ہمہ اوست

اپنشدوں میں خدا کو پہچاننے کے لیے جس تعلیم کا سہارا لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں خدا کا ظہور ہوا ہے۔ ہر شے چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان، مقدس اور الہامی ہے کیونکہ اُس میں خدا کا ظہور ہے۔ خدا اپنا الگ سے کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ سب کچھ ہے۔ وہ بیک وقت تمام کائنات میں سمایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ہندوؤں کے ہاں کروڑوں دیوتا ہیں اور سانپ اور بندر سمیت بے شمار اشیا کی پوجا کی جاتی ہے۔

اپنشد کے مطابق خدا در حقیقت ہماری سوچ سے ماورا اور لا محدود ہے۔ ہم چاہیں اسے کسی نام یا صفات سے یاد کر لیں لیکن وہ الفاظ، صفات اور سوچ چونکہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہوگی اس لیے محدود ہوگی جبکہ برہمن یا آتمن ہر طرح کے الفاظ اور تصور سے پاک ہے۔ ہمیں خدا کے وجود کا علم صرف اس کی کائنات سے ہو سکتا ہے۔ خدا در اصل ابدی قوت اور کائنات کی روح ہے 'اور کائنات کی تمام بڑی چھوٹی چیز اور لوگوں کے دلوں میں ہے۔ اس تصور کو مسلم صوفیا کے ہاں وحدت الوجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

2۔ عقیدۂ تثلیث (تری مورتی)

ہندو مت میں اصلاح کی خاطر جو تبدیلیاں کی گئیں ان میں تری موری کا تصور نہایت اہم ہے۔ اس کی رو سے حقیقی خدا یا دیوتا تین ہیں۔ باقی تمام خدا، دیوتا و دیویاں انہی کے ماتحت ہیں۔ ان میں سے ایک خالق، ایک نگہبان یا رب اور ایک تباہ و برباد کرنے والا ہے۔ ان تین خداؤں کا نام بالترتیب درجہ برہما، وشنو اور شیو ہے۔

برہما سے مراد خالق ہے۔ یہ دیوتا کائنات کا نقطہ آغاز مانا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ بھی بہت اونچا ہے۔ لیکن بلند مقام ہونے کے باوجود برہما کو مذہبی مآخذ بالخصوص ہنود کی مذہبی زندگی میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اجمیر میں قائم ایک قدیم آریائی مندر کے علاوہ اس دیوتا کے مندر ہندوستان میں شاذ و نادر ہیں۔ دوسرے خدا کا نام وشنو ہے، جس کے معنی ہیں نگہبان یا چلانے والا۔ جیسا کہ برہما اس کائنات کا خالق تھا، اسی طرح اس طرح کائنات محافظ اور نگہبان وشنو دیوتا ہے۔ وشنو کا کردار رحمدل بتایا گیا ہے جو مخلوق کی حفاظت اور معاونت کے لیے وقتاً فوقتاً جزئی یا کبھی کلی طور پر بشری، انسانی اور مختلف صورتوں میں دنیا میں آتا ہے جسے اوتار کہا جاتا ہے۔

تیسرا خدا شیو ہے۔ شیو سے مراد ہے تباہ کرنے والا۔ مورخین کے مطابق یہ دیوتا قدیم ہندو تہذیب کی ان باقیات میں سے ہے جو آج بھی موجود ہے۔ وادیٔ سندھ سے برآمد کئی ایسی مہریں ملی ہیں جن سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ شیو یا اس جیسے کسی اور دیوتا کی پرستش قدیم دور میں بھی کی جاتی تھی۔ ہندوؤں میں یہ دیوتا ایک غضبناک حیثیت رکھتا ہے۔ جو اپنی وحشت اور جلال سے سب کو اپنے

آگے جھکا دیتا ہے۔اس کی پرستش لنگ یعنی عضو تناسل کے توسط سے کی جاتی ہے۔ اس کی محبوبہ بیوی پاروتی ہے جس کی بہت سی صورتیں جیسے اوما، کامی اور درگاہیں۔ اوما کی صورت میں پاروتی ایک رحم دل ماں، کامی کی صورت میں قدرتی آفات کی دیوی اور درگا کی صورت میں ایک خوفناک دیوی ہے۔

3۔اوتار

لفظ اوتار (Avatar) دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ او کا مطلب ہے نیچے، اور تار کا مطلب ہے آنا یا گزرنا، یعنی اوتار سے مراد وہ جو نیچے اترا یا وہ جو نیچے آیا۔ بعض علماء کے مطابق اوتار لفظ اوترنا سے ہے جس کے معنی خدا کا ظہور یا اس کی طرف سے تنزل ہے۔سے مراد زمین پر کسی بھی صورت میں دیوتا یا خدا کا نزول ہے۔ اس عقیدے کے مطابق خدا نیک لوگوں کی مدد، دھرم کی قیام اور برائی کے خاتمہ و بیخ کنی کے لیے اکثر لباسِ بشری و حیوانی میں دنیا میں آتا ہے۔ اس کے لیے خدا کوئی بھی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ہندو دھرم کا یہ اہم ترین عقیدہ ویدوں میں کہیں نہیں ملتا البتہ پران اور گیتا میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

4۔متعدد دیوی دیوتا

دیوتا کا مطلب خدا یا ایسی مقدس ہستی ہے جو خدائی صفات رکھتی ہو بہت سے تصرفات کی حامل ہو۔ اس کی مونث دیوی ہوتی ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے چھوٹے g کے ساتھ god کا لفظ استعمال ہوتا ہے جبکہ بڑے G کے ساتھ God اللہ تعالی کے استعمال ہوتا ہے۔ ہندومت میں دیوتا وہ قابل پرستش مقدس ہستیاں ہیں جن سے مخلوق کو مختلف قسم کے فیض حاصل ہوتے ہیں۔ کتاب ہندوازم کے مصنف مسٹر گونداس کی تحقیق کے مطابق ویدوں میں 33 دیوتا تھے لیکن موجودہ ہندومت میں وہ خدا اور دیوتا جن کی پرستش کی جاتی ہے، ان کی تعداد 33 کروڑ تک بتائی جاتی ہے۔ ان میں، سورج، چاند، آگ، ہوا، ومنا، متنگی، سائیں ہنومان، (بندر دیوتا) اِندر، کرما، شکتی، رام، کرشنا، سگن، ورن، اور بدھ مشہور ہیں۔

دیوی دراصل خدا کی محبوبہ یا بیوی مانی جاتی ہیں۔ ان دیویوں میں رام کی بیوی سیتا، کرشن کی محبوبہ رادھا، برہما کی بیوی سرسوتی، شیو کی بیوی پاروتی، کرشن کی ملکہ خاص رکمنی اور اس کے علاوہ قدیم تہذیبوں سے تقدس کی حامل رہنے والی دیویاں درگا، گنگا، مایہ، اور دھومرتی معروف ہیں۔

5۔شرک میں توحید اور توحید میں شرک

مروجہ ہندو دمت میں جہاں بے شمار مظاہر فطرت، دیوتاؤں کی قابل پرستش سمجھا جاتا ہے، وہیں ان کے سب کے پس پردہ ایک عظیم واحد ہستی بھی پوشیدہ ہے۔ تمام دیوتا اور خدا اپنے اپنے بھگتوں (بندوں) کے لیے خدائے واحد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک

یہ ضروری نہیں کہ خدائے واحد کو تسلیم کرنے کے لیے دوسرے دیوتاؤں کا انکار کیا جائے، بلکہ وہ دوسرے دیوتاؤں کو اپنے مخصوص دیوتا کے ماتحت جانتا ہے۔ ویدوں کے مطابق اگنی، وایو، وشنو، شیوا در حقیقت ایک ہی خدا ہے۔ پجاریوں نے انہیں مختلف کر دیا ہے۔ رگ وید میں ہمیں اسی قسم کا بیان ملتا ہے کہ پجاری ایک ہی خدا کو بہت سے ناموں سے پکارتے ہیں۔"[1]

6۔مادہ اور روح

مادہ اور روح کے متعلق اہل ہنود کا عقیدہ ہے کہ مادہ ار روح دونوں ہی ازلی ہے یعنی ان میں کوئی فرق نہیں اور دونوں کو ہی خالق کا درجہ حاصل ہے، اس عقیدے کے اعتبار سے خدا بھی مادہ اور روح کا محتاج قرار پاتا ہے۔

تناسخ

یہ وہ واحد عقیدہ ہے جو تمام ہندوؤں میں مشترکہ طور پر مسلم ہے، ہندی زبان میں اسے آواگون کہا جاتا ہے۔ جس کے مطابق اپنے پچھلے کرم یعنی گناہوں کے باعث بار بار جنم لینا ہے۔ جزاو سزا کے اس تصور کو ہندو "کرم" کہتے ہیں۔ اعمال کی جزاو سزا کے سلسلے میں ہندوؤں کا عقیدہ اسی نظریہ کے گرد گھومتا ہے۔ جس کے مطابق حیوانات، نباتات، معذور، غریب وغیرہ سب اپنے پہلے جنم میں عموں سے آزاد انسان تھے، لیکن اپنے برے اعمال کے سبب ان کی روح یہ صورت یہ شکل اختیار کر گئی۔ اور تمام خوشحال انسان اپنے پچھلے جنم میں اچھے کاموں کا ثمر حاصل کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص معذور ہے تو یہ دراصل اس کے پچھلے جنم کے برے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور ایک شخص طاقتور اور صحت مند ہے تو یہ اس کے اچھے اعمال کا نتیجہ ہے جو اس نے پچھلے جنم میں کیے۔

ہندومت میں نجات (مکتی) پر بہت اہمیت دی گئی ہے۔ جس کے مطابق خدا انسان کے گناہوں کو معاف نہیں کرتا اور نہ ہی بعد الموت اس کی روح کو گناہوں سے پاک کر سکتا ہے۔ اور چونکہ انسان کی روح اسی سے نکلی ہے اسی لیے انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کی روح خدا میں ضم ہو جائے۔ لیکن روح تب تک ضم نہیں ہوتی جب تک کہ وہ گناہوں سے پاک نہ ہو۔ لہٰذا پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے روح کو تب تک جنم لینا ہوتا ہے جب تک کہ روح اپنے اعمال کا صلہ مختلف صورتوں میں بھگت کر پاک نہ ہو جائے۔ اور بار بار پیدا ہونے کے چکر سے نجات نہ پالے۔ جب یہ روح مکمل طور پر پاک ہو جاتی ہے تو پھر یہ بھگوان میں جا ملتی ہے۔

اہمسا(Ahimsa)

ہندو مذہب پر پانچویں صدی قبل مسیح کی دو تحریکوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے: ایک جین مت اور دوسرا بدھ مت۔ بت پرستی کے علاوہ

[1] رگوید۔منڈل 1۔سوکت 164۔منتر 64

اہمسا یا اہنسا کا تصور بھی ہندوؤں نے ان مذہب کے پیروکاروں سے ہی سیکھا تھا۔ اہمسا کے لغوی معنی عدم تشدد ہے۔ ہندومت کے تمام فرقوں میں ان دون مذاہب سے قبل قربانی کی رسم رائج تھی، حتیٰ کہ بعض فرقوں کے نزدیک پرش میدھ یعنی انسانی قربانی بھی ثواب کو موجب تھی۔ لیکن ان مذاہب کے ظہور کے بعد لوگوں میں عدم تشدد کا فلسفہ رائج ہوا، لوگوں میں یہ تصور اس قدر طاری ہو چکا تھا کہ بلا ضرورت کسی بھی جاندار کو مارنا ان کے نزدیک جائز نہیں تھا، اس تصور کی وجہ سے ہندو راہبوں نے اپنی زندگی انتہائی کٹھن کر دی تھی۔ وہ پانی نہیں ابال سکتے تھے کیونکہ اس سے اس میں موجود جراثیم ہلاک ہو جاتے۔ ہل نہیں چلاسکتے کہ اس سے حشرات الارض کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مچھر یا مکھی بھی ڈنگ مارے تو بھی کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ گوتم بدھ یا مہاویر نے گوشت خوری کے متعلق کوئی واضح ہدایات نہیں دی تھی، لیکن غالباً ان مذاہب میں اس تصور کو تقویت فلسفہ ہمہ اوست کے سبب ملی ہوگی، جب ہر شے میں خدا کو دیکھا جائے تو پھر اسے کیسے کسی قسم کا نقصان پہنچایا جاسکتا ہے؟

عبادات

پوجا

ہندوستان میں مجسمہ سازی کا فن قدیم تہذیب کا ورثہ تھا، لیکن اس فن کو مذہبی حیثیت سب سے پہلے بدھ مذہب کے لوگوں نے دی، سب سے پہلے گوتم بدھ کا بت گندھارا تہذیب کے فنکاروں نے پہلی صدی عیسوی میں بنایا، ان کے یہ مجسمے اتنے شان دار تھے کہ اس سے دیگر فرقے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جین مت کے لوگوں نے بھی اپنے بزرگوں کے مجسمے بنانے شروع کر دیے۔ دوسری صدی عیسوی میں مجسمہ سازی کا یہ فن متھرا تک پہنچ چکا تھا اور دوسری صدی عیسوی تک بنارس، آندھرا اور امراوتی میں بھی بت بنائے جانے لگے۔ ہندو، بدھ جین سبھی نے اپنے معبودوں کو نظر آنے والی صورت میں پسند کیا اور دیوتاؤں کی مورتیاں مقدس کتابوں میں بیان کردہ خدوخال کو سامنے رکھتے ہوئے بنائی۔ مثلاً گیتا میں برہما کو وشوتومکھم یعنی ہر طرف منہ والا کہا گیا تو اس کے پیش نظر ہندوؤں نے برہما کا بت ایسا بنایا کہ اس کے منہ چاروں طرف تھے، اس طرح دیگر بت بنائے گئے اور ان کی پوجا شروع ہوگئی۔

پوجا ہندوؤں کے مذہب کا سب سے بڑا مظہر ہے جو مختلف مراسم کے ساتھ مختلف ادوار میں انجام دی جاتی ہے۔ پوجا کا اہتمام مندروں میں کیا جاتا ہے، دیوتاؤں کی مورتیوں کے علاوہ مختلف حیوانات کی مورتیوں کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ پوجا کی رسم میں مورتیوں کے سامنے گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں، پھولوں کا ہار، غذاؤں اور خوشبوؤں کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے حضور سجدے کیے جاتے ہیں اور مقدس ادبیات سے مناجات پڑھی جاتی ہیں اور پھر ان مورتیوں سے مرادیں بھی مانگی جاتی ہیں۔

یہ کہنا غلط ہو گا کہ ہندو حضرات بت یعنی ایک پتھر کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ مورتیاں کسی دیوتا یا اوتار کی شخصیت کو ظاہر کر رہی ہوتی ہیں۔ پتھر کی ان مورتیوں کو کسی شخصیت سے منسوب کر دیا جائے تو ایک ہندو کے نزدیک پھر اس پتھر کی مورتی کی تقدیس و پرستش لازم ہو جاتی ہے۔



پالن پور مندر۔ بھارت http://www.palanpuronline.com(28 Feb 2013)



یگیہ کا ایک منظر acharya-vijay.com (28 Feb 2013)

یگیہ یا یجنا (قربانی)

یگیہ کو عام معنوں میں قربانی کہا جاتا ہے۔ ہندو تہذیب میں یگیہ کی رسم قدیم غیر آریائی تہذیب سے رائج ہے۔ لیکن اس کے طریقے

مختلف عہد میں تبدیل ہوتے رہے اور تبدیلی کا سفر طے کرتے ہوئے موجودہ دور میں یگیہ کی رسم میں مختلف قسم کے اناج، پھلوں، اور جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے۔ اناج اور پھلوں کی قربانی کا مفصل اور طویل ذکر ہمیں یجر وید میں ملتا ہے جس کا موضوع ہی یگیہ ہے۔ جبکہ جانوروں کی قربانی کا ذکر ہمیں قدیم صحائف یعنی برہمنا اور رگوید میں ملتا ہے۔ قانونِ مقدس میں جانوروں کی قربانی کرنے والوں کو ہدایت ہے کہ حتیٰ الامکان کم تکلیف دی جائے البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کا کچھ خون دیوتا کی مورتی (بت) پر گرے۔ زیادہ تر قسم کے یگیہ میں قربانی کے بعد اناج یا گوشت وغیرہ کھایا نہیں جاتا بلکہ یہ خدا کا حصہ مانا جاتا ہے۔

جاپ

جاپ کا مطلب تسبیح اور ذکر کرنا ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح ہندوؤں کے ہاں بھی دیوتاؤں کے نام اور مقدس کتابوں سے مختلف منتروں کی تسبیح اور وظیفے پڑھے جاتے ہیں اور داخل عبادت سمجھا جاتا ہے۔

تہوار ور سوم

ہندوؤں کے ہاں تہواروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، بعض تہوار مخصوص خطے کے ہندو مناتے ہیں۔ ذیل میں ہم انہی تہواروں کا ذکر کریں گے جو تقریباً تمام ہنود مناتے ہیں۔

1۔ دیوالی (Devali)

لفظ دیوالی کے معنی دیو کی قطار ہے۔ یہ ہندوؤں کا ایک تہوار ہے جو ہندی کیلنڈر کا مہینہ کاتک کی پندرہ تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اسے دیپاولی یعنی روشنیوں کی قطار اور روشنیوں کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ اس تہوار میں ہندو کسی دریا یا تالاب میں نہا کر نیا لباس پہنتے ہیں اور شرادھ (نذر و نیاز) کرتے ہیں۔ دیے جلائے جاتے ہیں اور بڑے پیمانے پر آتشبازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ مختلف خطوں اور عقیدے کے لوگ اپنے اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور سب مل کر جوا کھیلتے ہیں۔

اگرچہ یہ تہوار ہندوؤں کے لیے یہ تہوار سال بھر میں انتہائی اہم ہوتا ہے لیکن اس کے آغاز اور اس کی بنیاد کے بارے میں ہندو علماء ہاں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ البتہ سب سے مقبول عقیدہ یہ ہے کہ جب شری رام چندر چودہ برس بعد راون کو مار کر واپس اپنے شہر ایودھیاء آئے تو وہاں کے لوگوں نے اس خوشی میں دیے جلائے اور بھرپور چراغاں کیا اسی کی یاد میں دیوالی منائی جاتی ہے۔ تاہم ہمیں رزمیہ ادب میں دیوالی کے بارے میں اس قسم کی کوئی روایت نہیں ملتی۔

2۔ہولی (Holi)

ہولی موسم بہار میں منایا جانے والا ہندومت کا مقدس مذہبی اور عوامی تہوار ہے۔ یہ تہوار ہندو کیلنڈر کے مطابق پھاگن مہینے میں پندرہویں تاریخ پورما کو منایا جاتا ہے۔رنگوں کا تہوار جانے والا یہ تہوار روایتی طور سے دو دن منایا جاتا ہے اور ان دنوں اہل ہنود ایک دوسرے پر رنگ پھینک کر تفریح سے محفوظ ہوتے ہیں۔لوگ ایک دوسرے کو رنگنے اور نغمے بجانے کے بعد غسل کر کے نئے کپڑے پہن کر لوگ ایک دوسرے کے گھر ملنے جاتے ہیں، گلے ملتے ہیں اور مٹھائیاں کھلاتے ہیں۔اکثر گھروں کے آنگن کو رنگوں سے نقشین کیا جاتا ہے اور محفلوں میں بھنگ کا بھی خاص اہتمام ہوتا ہے۔پورے ہندوستان سمیت ان تمام ممالک میں مختلف ناموں کے ساتھ رنگوں کا یہ تہوار منایا جاتا ہے جس کا تعلق ہندومت سے ہے۔

یہ تہوار ہندوستان میں جس قدر قدیم ہے اس کی تاریخ بھی اسی قدر گم ہے۔مورخین کے مطابق قدیم تہذیب میں یہ تہوار موسم بہار کی آمد کی خوشی میں آریوں کے ہاں بھی منایا جاتا تھا۔البتہ ہندومت کی مقدس کتابوں میں اس رسم کا واضح ذکر ہمیں پرانوں میں ملتا ہے جس میں اسے رنگ کا تہوار بتایا گیا ہے۔لیکن اس تہوار کی وجہ کے متعلق کئی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔

عام طور پر مشہور ہے کہ ہریکشپ جو کہ ایک طاقتور اور شیطانی دیو تھا،اس نے دھرتی پر حکم جاری کیا کہ اب کوئی بھی خدا کا نام نہ لے اور نہ ہی خدا کی عبادت کرے۔ اس بدکار دیو کے خوف سے لوگوں نے اسے پوجنا شروع کر دیا، جبکہ اس کا بیٹا جو کہ خدا کا ایک حق پرست اور جاں نثار بندہ تھا، اس نے اپنے باپ کی مخالفت کی اور اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ہریکشپ اس کی اس جرأت پر سخت برہم ہوا اور اس کے لیے سخت سزا کا حکم سنایا۔لیکن اس حق پرست بندے کو اس سزا سے کچھ فرق نہیں ہوا۔ہولیکا، جو کہ ہریکشپ کی بہن تھی، اس نے ہریکشپ کے بیٹے پرلہاد کو یہ قوت تحفہ کی کہ آگ اس کے لیے اب بے ضرر ہو گئی۔ہریکشپ نے دونوں کو آگ میں ڈلوایا جس کے نتیجے میں اس کی بہن مر گئی جبکہ اس کے بیٹے کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔اسی داستان کی یاد میں آج ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے۔اس داستان کے علاوہ ہولی کو رادھا اور کرشن کی محبت سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

3۔نوراتری(Navaratri)

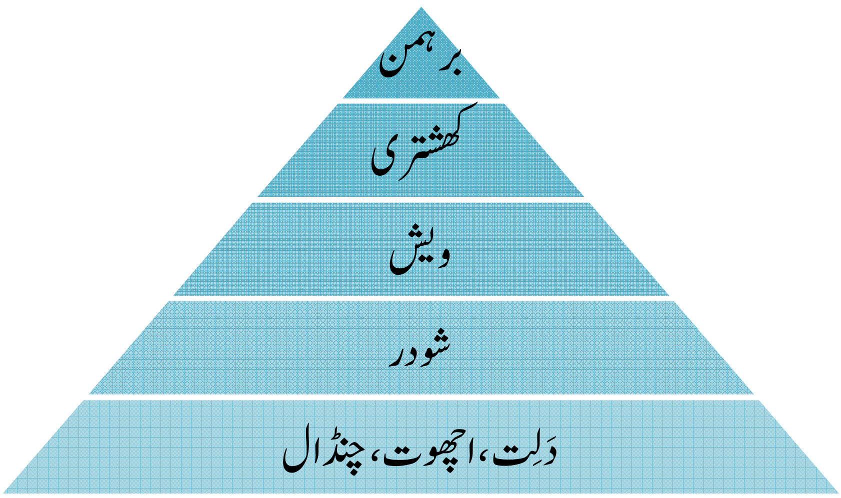
یہ تہوار نوراتوں تک منایا جاتا ہے۔اس روز شکتی دیوی کی پوجا کی جاتی ہے۔اسے عام طور پر دُرگا پوجا بھی کہا جاتا ہے۔اس تہوار میں ہندو رقص وموسیقی کی محافل منعقد کرتے ہیں اور خاص طور پر ڈانڈیا کھیلتے ہیں۔ہندومت کے دیگر تہواروں کی طرح اس تہوار کے متعلق بھی کئی روایات منسوب ہیں جن میں سے کسی ایک کو یقینی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

معاشرتی نظام

طبقاتی نظام

ہندوؤں کے معاشرتی نظام میں سب سے اہم امر ورن آشرم ہے۔ ورن کے معنی رنگ کے ہیں۔ گذشتہ اوراق میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ہندوستان میں ابتدائی طور پر یہ طبقے پیشے کے لحاظ سے تھے لیکن آریوں نے اپنی نسل کے حفاظت کے لیے اسے مذہبی قانون میں ڈھال دیا اور اس پر سختی سے پابند رہے۔ یہ نظام وقت کے ساتھ ساتھ مزید پروان چڑھتا گیا۔ بعد ازاں اسے منو دھرم شاستر میں مزید تقویت دی گئی اور اسے معاشرے کا لازمی جز قرار دے دیا۔

اس طبقاتی نظام کی رو سے سب اعلیٰ سے تین طبقے بنے۔ بالترتیب درجہ برہمن، کھشتری اور ویش۔ ان تینوں طبقات میں آریائی لوگ ہی شامل تھے۔ جو کہ سفید جلد والے لمبے قد اور اچھے نقش کے حامل تھے۔ جبکہ مقامی باشندے یعنی ہندوستان کی قدیم اقوام جن کا رنگ سیاہ تھا اور جو کہ پست قد تھے شودر اور اس سے بھی ادنیٰ طبق میں شمار ہوئے اور انہیں معاشرے کی نچلی مخلوق قرار دیا گیا۔ برہمن، کھشتری، ویش، اور شودر کی اس تقسیم کے بعد ان طبقات کے مختلف خصائص اور حقوق متعین کیے گئے ہیں۔ ہندو عقائد کی رو سے سب سے بلند مرتبہ ذات برہمن ہے کیونکہ وہ خدا کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کھشتری جو خدا کے بازوؤں سے، پھر ویش جو رانوں سے، اور پھر ہندوؤں کے نزدیک سب سے نچلی ذات شودر جو خدا کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ دورِ جدید میں ہندو مصلحین مثلاً آریاسماج وغیرہ ذات پات کی شدید مخالفت کرتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ ذات پات کا تعلق ہندومت سے نہیں ہے۔



آشرم

برہما دور کے آخری حصے میں ہندومت کے معاشرتی نظام کا دوسرا اہم امر وجود میں آیا جسے آشرم کہتے ہیں۔ اس کے مطابق انسان کی

اوسط عمر 100 سال مان کر پہلی تین ذاتوں کے افراد کی زندگی کو پچیس پچیس سال کے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل یوں ہے:

1. بریم چریہ آشرم: پہلے 25 سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنا، ویدوں کو پڑھنا اور سمجھنا۔
2. گرہتھ آشرم: 25 کے بعد سے 50 برس کی عمر کو تک خاندان کی کفالت، مقدس کتابوں کا مطالعہ، قربانی، نذر و نیاز اور دیگر فرائض ورسوم انجام دینا۔
3. وان پرستھ آشرم: 75-50 سال کی عمر تک رہبانیت اختیار کرنا اور آرنیک نامی مذہبی کتب کا مطالعہ کرنا۔
4. سنسان آشرم: 75 سال کی عمر کے بعد فقیر بن کر زندگی گزارنا اور کسی ایک جگہ قیام نہ کرنا۔

ہندو دھرم اور راہِ نجات

نجات کو ہندی زبان میں مکتی کہا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر ہندوؤں کے نزدیک نجات کے تین طریقے ہیں۔ یہ تین راستے یوگا اور مارگ بھی کہلاتے ہیں: کرم مارگ؛ گیان مارگ اور بھگتی مارگ۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

کرم مارگ

کرم مارگ کے معنی راہِ عمل ہے۔ مکتی کے لیے راہِ عمل سے مراد یہی ہے کہ اپنے دھرم پر ڈٹ کر عمل کیا جائے۔ یعنی ہر ذات کے لیے اس کا مخصوص عمل ہے جس سے وہ نجات پا سکتا ہے۔ برہمن کی نجات کی راہِ عمل مذہبی ذمہ داری ادا کرنا ہے، کھشتری کی راہِ عمل خیرات دینے اور جنگ میں لڑنا، ویش کی نجات زراعت و تجارت اور شودر کی نجات مندرجہ بالا ذاتوں کی خدمت کرنے میں مضمر ہے۔

گیان مارگ

گیان ہندی زبان میں علم کو کہتے ہیں۔ ہندو فلسفیوں نے مکتی کی جو تیسری راہ بتائی وہ راہِ علم ہے۔ علم سے مراد وہ ذہنی علم نہیں جسے عام طور پر عصری علوم بھی کہا جاتا ہے بلکہ اس علم سے مراد روحانی شعور حاصل کرنا ہے۔ یہ علم اپنشدوں کے گہرے مطالعے، اپنی تخلیق پر غور اور مراقبے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کی آخری منزل خود آگاہی ہے۔ یعنی انسان خود خدا کی ذات کا حصہ ہے۔ اس کیفیت کو ہندوؤں میں موکش اور گیان کہا جاتا ہے۔

بھگتی مارگ

بھگتی کے معنی غلامی ہے۔ عام مفہوم میں بھکتی سے مراد یہ ہے کہ دیگر دیوتاؤں کا انکار کیے بغیر کسی ایک کو خدائے واحد تسلیم کیا جائے اور دوسرے دیوتاؤں کو اپنے مخصوص دیوتا کے ماتحت جان کر محبت و یکسوئی قلب کے ساتھ اسی شخصی دیوتا کی پرستش کی جائے۔ اس کی محبت میں اس قدر محو ہو جانا کہ اور پھر کسی کا خیال نہ آسکے اور بندے کی تمام امیدیں اسی دیوتا سے وابستہ ہوں۔ گویا بندہ اس دیوتا کی محبت میں خود کو فنا کرلے۔

ہندو فرقے اور تحریکیں

دیگر مذاہب عالم کی طرح اہل ہنود کے ہاں بھی مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں مگر ان کے فرقوں کی تعداد دیگر مذاہب کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ قدیم فرقوں کی بنیاد فلسفہ اور خدا اور انسان کے تعلق کے متعلق بحث سے پڑی، جبکہ نئے فرقے اسلام اور عیسائیت سے متاثر ہو کر تشکیل پائے۔ ان فرقوں میں ایسے گروہ بھی شامل ہیں جو سرے سے خدا کے منکر ہیں اور وہ بھی ہیں جو سب کچھ خدا کو ہی قرار دیتے ہیں، توحید و مساوات کی طرف دعوت دینے والا دانشور طبقہ بھی ہے اور ان گنت دیوتاؤں کی پرستش کرنے والے، رقص و موسیقی کی محفل سجانے والے اور بت پرستی کرنے والا طبقہ بھی موجود ہے۔ اس مذہب میں موجود حیرت انگیز لچک کے باعث روزنت نئے فرقے پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہوتے ہیں، لہٰذا اس مذہب میں موجود تمام فرقوں کے بارے میں جائزہ لینا ہماری مختصر تحریر میں ناممکن ہے۔ ہم یہاں چند ایک مشہور اور بااثر فرقوں کا ہی ذکر کریں گے۔

وشنوازم

ہندومت کے بیشتر فرقے خدا اور انسان کے مابین تعلق کی تشریح کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں، انہی فرقوں میں سے ایک مقبول فرقہ 'وشنومت ہے جس کی بنیاد صرف وشنو دیوتا کی پرستش پر رکھی گئی، اس فرقے کی مزید تین شاخیں ہیں جن میں رام نوج(d. 1485) کا مکتب فکر اور دلا بھالا (d. 1479) مشہور ہیں۔ اول الذکر فرقے میں رقص و موسیقی اور بھجن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جبکہ دوسرا فرقہ چند خاندان کے ممتاز ہونے پر اصرار کرتا ہے جن کے علاوہ کوئی مندر تعمیر نہیں کرسکتا۔

وشنومت فرقے کی خاص بات یہ ہے کہ اس فرقے کے پروہتوں نے ہندومت کو عوام الناس کے لیے دل چسپ بنانے کا بھرپور انتظام کیا، اور اسے عام لوگوں کے تقاضے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، روایتی طریقہ کے برعکس انہوں نے سنسکرت کے بجائے تامل اور ہندی کو مذہب کی تبلیغ کے لیے استعمال کیا اور ہندومت کی اشاعت عام زبانوں میں کی۔ اس تحریک سے قبل مذہب کی تعلیم سنسکرت

کے علاوہ کسی اور زبان میں دینا گناہ کا موجب سمجھا جاتا تھا۔اس کے علاوہ وشنو مت میں اگرچہ چند مخصوص خاندان کو خاص امتیاز حاصل ہے لیکن ذات پات کے خلاف انہوں نے شدید آواز بلند کی۔

شیومت

یہ فرقہ اہل ہنود میں قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے جس کے آثار ہمیں موہن جوڈرو اور ہڑپا میں بھی ملتے ہیں۔اس فرقے کی بنیادی تعلیم شیو اور اس کی بیوی کالی ماں کی پرستش ہے جو لنگ اور یونی یعنی عضو تناسل کے ذریعے کی جاتی ہے۔ شیو کی پرستش کے لیے انسان و حیوان دونوں ہی مورتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس فرقے کی عبادت کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ جسم پر راکھ مل کر رقص و موسیقی کی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور بیل کی آواز نکالتے ہیں۔ البتہ یہ رسوم زیادہ تر صرف مذہبی طبقہ ہی ادا کرتا ہے، عام لوگ محض ان میں شریک ہونے کو متبرک سمجھتے ہیں۔ اس فرقے میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو مردوں کو دفناتے ہیں، گوشت خوری جائز کہتے ہیں اور آزادانہ جنسی تعلقات کے حامی ہیں۔

شکتی بھکت

اپنی تعداد کے لحاظ سے یہ فرقہ ہندوؤں میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ لوگ خدا کو ماں کی مثل مانتے ہیں، اس فرقے میں کوئی الگ خاص عقائد نہیں ہیں البتہ ان کے فلاسفہ روح (پرش) کو مذکر اور مادہ (پراکرتی) کو مونث مانتے ہیں۔ہندومت کے مشہور علماء شنکر آچاریہ اور سوامی ویویک آنندا(1863-1902)اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

سمرتی مت

ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد سمرتی مت سے تعلق رکھتی ہے۔ سمرتی ازم سے مراد وہ مکتب فکر ہے جو کسی فرقے سے تعلق نہیں رکھتے نہ ہی خود کو کسی خاص دیوتا سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ لوگ دیوتاؤں کی پرستش کے معاملے میں آزادی کے قائل ہیں، یعنی ایک ہندو جس کی پرستش کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ یہ مکتب فکر خود کو ایک بڑے ہندو ریفارمر آدی شنکر(788-820CE) سے منسوب کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندو دھرم وہ مذہب ہے جس میں خدا کو کسی بھی صورت میں پوجا جا سکتا ہے۔ عصر حاضر میں تعلیم یافتہ ہندوؤں کی اکثریت اس سے وابستہ ہے۔ سمرتی مت سے تعلق رکھنے والے لوگ سمرتی زمرے میں آنے والی سبھی کتابوں کو انتہائی اہمیت دیتے ہیں۔

آریا سماج

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندو دھرم میں جو اصلاحی تحریکیں اٹھیں ان میں سے ایک آریا سماج ہے۔ یہ فرقہ دورِ حاضر ہیں

سوامی دیانند سرسوتی کے ہاتھوں تشکیل پایا ہے۔ ہندوؤں میں یہ فرقہ اگرچہ بہت کم تعداد میں ہے، لیکن یہ ایک بااثر فرقہ ہے۔ آریا سماج والے عقیدۂ اوتار کا شدید انکار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق شری کرشن جیسے صالح لوگوں کو خواہش ہوتی ہے کہ وہ دھرم کے قیام کے لیے دوبارہ جنم لیں چنانچہ اس میں کسی قسم کا کوئی عیب نہیں ہے کہ وہ اس کا اظہار (گیتا میں) کریں، جو لوگ اوتار کے قائل ہیں وہ دراصل وید سے جاہل ہیں۔ اسی طرح وہ بت پرستی اور ذات پات کی بھی مخالفت کرتے ہوئے توحید اور مساوات کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان کا نعرہ ہے کہ حقیقی ویدک دھرم کی طرف لوٹو۔ سوامی دیانند سرسوتی نے وید کا ترجمہ اور تفسیر (بھاشیہ) بھی لکھی ہے جس کی اکثر پنڈتوں نے مخالفت کی تاہم اب یہ مقبول ہو چکی ہے۔

برہمو سماج

اس فرقے کے بانی رام موہن رائے تھے جو 1774 میں بمقام بردوان ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہیں انگریزی، عربی، فارسی، بنگالی اور سنسکرت کے علاوہ لاطینی، فرانسیسی، یونانی اور عبرانی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ انہوں نے وید سمیت دیگر مذاہب عالم کی کتب مقدسہ کا مطالعہ کیا اور 39 سال کی عمر میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کی تعلیمات کا محور کم عمری میں شادی، بت پرستی، کثرت ازدواج، الوہیت مسیح علیہ الصلوۃ السلام، ستی کی ظالمانہ رسم اور ذات پات کے امتیاز کی مخالفت تھی۔

گاندھی تحریک

اس تحریک کے بانی مہاتما گاندھی تھے جو کہ ایک معروف مذہبی اور سیاسی شخصیت ہیں۔ انہوں نے رہبانیت، اہمسا اور سادگی کے اصولوں پر زور دیا اور ذات پات کی مخالفت کرتے ہوئے تمام انسانوں کے برابر ہونے پر زور دیا۔ انہوں نے اچھوت طبقے کو "ہریجن" یعنی خدا کے بندے قرار دیا اور انہیں عزت دی۔۔ اس وقت ان کی تحریک کو ہندوستان میں سرکاری سرپرستی حاصل ہے اور انہیں بابائے قوم سمجھا جاتا ہے۔ گاندھی تحریک کے آشرم پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اسائن منٹس

1. ہندو دھرم کیا ہے؟ چند جملوں میں لکھیے۔
2. طبقاتی نظام کے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ نیز اس ضمن میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کیجیے۔
3. ویدوں کے معنی اور اس کی تالیف و تدوین کی مختصر تاریخ لکھیے۔

باب 4: بدھ مت

تاریخِ عالم پر ایک سر سری نگاہ ڈالنے سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں دنیا کے اکثر علاقوں میں کئی مذہبی تحریکیں اٹھی جو اپنے وقت میں رائج مذاہب کی پیچیدگیوں اور اس کا حصہ بن جانے والی برائیوں کے خلاف ظاہر ہوئی تھیں اور ان تحریکوں نے لوگوں کی اصلاح پر بھرپور توجہ دی۔ اسی قسم کا ایک مذہب بدھ مت ہے جو ایک مشہور فلسفی رہنماء مہاتما گوتم بدھ سے منسوب ہے۔ بدھ مت ایک صوفیانہ قسم کا مذہب ہے جس کی ابتداء پانچویں صدی قبل مسیح میں نیپال میں ہوئی اور آج بدھ مت دنیا کے اہم ترین مذاہب میں سے ایک ہے۔

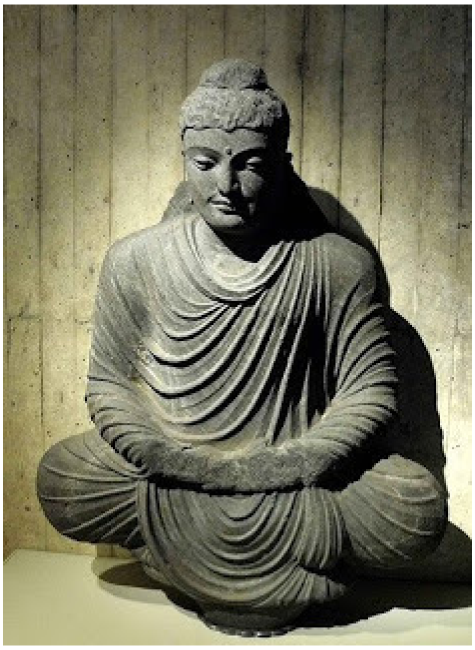
بدھ مذہب کی تاریخ

گوتم بدھ سے قبل ہندوستان کی مذہبی حالت

اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں اور ہندوستان کی عظیم سرزمین کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ چھٹی سے چوتھی صدی قبل مسیح کا دور ہندوستان کے لیے کافی اہمیت کا حامل تھا۔ اس عہد تک آریا اور ہندوستان کی مقامی مذہبی روایات آپس میں گڈ مڈ ہو چکی تھیں۔ مذہبی رسومات پیچیدہ ہوتی جارہیں تھیں اور ان پر ایک خاص طبقے (برہمن) کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی جنھوں نے خود کو تمام لوگوں سے افضل اور ممتاز قرار دے دیا تھا۔ سنسکرت زبان کی ترتیب بھی اسی دور میں کی گئی۔ مذہب میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ چار ذاتیں وجود میں آ گئیں تھیں جس کا ذکر ہم نے ہندو مت میں کیا۔ ہندوستان کی فاتح اقوام نے اس طبقاتی نظام کو مذہبی حیثیت دیدی اور از روئے قانون ذاتیں آپس میں نہ شادی کر سکتی تھیں اور نہ ہی نہ ایک نشست میں بیٹھ سکتی تھے۔ بت پرستی عروج کو پہنچ چکی تھی اور مذہب میں کئی برائیوں کو داخل کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں میں عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ ذات پات کے نظام سے بیزار ہو چکا تھا یہ لوگ ذات پات کے خلاف ایک ایسے نظام زندگی کی تلاش میں تھے جو ان کے لیے روحانی اور دنیاوی حیات دونوں کا مسئلہ حل کر سکے۔ ایسے حالات میں اس دھرتی پہ ایک ایسی ہستی کا ظہور ہوا جو ان ہندوستانیوں کے لیے ایک مسیح ثابت ہوئے اور جنھوں نے ہندو مت کی خامیوں کو دور کر کے احترام انسانیت کا شعور عام کیا اور لوگوں کو زندگی کے مسائل سے چھٹکارے کے راستے بتلائے اور تاریخ مذاہب میں ایک باب کا اضافہ کیا۔ یہ ہستی مذاہب عالم میں معلم ایشیاء اور مہاتما بدھ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

گوتم بدھ

گوتم بدھ کی ولادت 563BC کے لگ بھگ موجودہ نیپال میں واقع لمبنی (Lumbini) میں ہوئی۔ یہ شہر اُس وقت شاکیہ نامی قبیلے کے دارالخلافہ "کپل دستو" میں تھا۔ گوتم بدھ اسی شاہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا اصل نام سدھارتھ تھا۔[1] محل میں ان کی پرورش انتہائی شاہانہ انداز میں کی گئی، انہیں سپہ گری کے سب فن سکھائے گئے اور سیر و تفریح کے تمام مشغلے موجود تھے لیکن ان کی طبیعت میں شروع سے ہی امن پسندی اور سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ نہایت قلیل مدت میں سدھارتھ نے اپنا تعلیمی سفر طے کیا اور جیسے جیسے ان کے علم میں اضافہ ہوتا گیا وہ مزید سنجیدہ اور متفکر رہنے لگے۔ وہ اپنے روز و شب کے بیشتر اوقات خلوت پسندی میں گزارتے تھے۔ وہ جوانی کے دور میں قدم رکھ چکے تھے، لیکن عام نوجوانوں کے برعکس ان میں کوئی جوش وولولہ نہ تھا۔ صرف ایک جنون تھا غور و فکر اور مراقبے کا، جو ان کی روح کو عارضی طور پہ طمانیت فراہم کر دیتی۔ ان کی اس سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے ان کے والد بہت پریشان تھے، انہوں نے اپنے وزراء سے مشورہ کر کے سدھارتھ کی شادی اپنی بھتیجی یشودھا سے کرا دی۔



گوتم بدھ ایک قدیم مجسمہ۔(گندھارا) (28 Feb 2013) http://thaimangoes.blogspot.com

شادی کے بعد اگرچہ راجہ کے سامنے سدھارتھ کے سنیاسی بننے کے کوئی آثار باقی نہیں رہے تھے۔ سب کچھ بظاہر ٹھیک ہو رہا تھا لیکن

[1] Manan Sharma, Buddhism (Teachings Of Buddha),page 31, Diamond Pocket Books (P) Ltd., 2002

خاموشی کے بعد بالآخر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، جس کا سبب سدھارتھ گوتم کے کچھ مشاہدات تھے۔ روایات کے مطابق ایک دن گوتم شاہی باغات میں تفریح کی غرض سے سیر کے لیے نکلے تو سڑک کے کنارے ایک نہایت ضعیف العمر شخص کو دیکھا جس کے چہرے کی جلد خشک اور جھڑیوں سے بھری تھی، دانت جھڑ چکے تھے۔ وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی خمیدہ کمر اور کمزوری اسے اٹھنے نہیں دے رہی تھی، وہ بار بار لڑکھڑا کے گرنے لگتا اور چھڑی کے سہارے خود کو سنبھالتا۔ ایک بار ان کے سامنے ایک بیمار شخص آیا جس کے جسم پر آبلے پڑے ہوئے تھے اور وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ ایک بار انہوں نے ایک میت دیکھی جس کو لوگ شمشان کی طرف لے جا رہے تھے اور اس کے عزیز و قارب ماتم کر رہے تھے۔ چوتھی اور آخری نشانی گوتم کی منزل کا راستہ بتلانے کے لیے تھی۔ گوتم نے ایک زرد لباس میں ملبوس فقیر کو دیکھا، جس کے پاس بظاہر کچھ نہ تھا لیکن وہ بہت پر سکون اور مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس فقیر کے چہرے پہ روحانیت، سرور اور طمانیت دیکھ کر گوتم حیران ہوئے اور انہوں نے پختہ عزم کر لیا کہ اب وہ بھی حقیقی خوشی، سکون اور اطمینان قلب کے لیے درویش بنیں گے۔ معرفت کے حصول کے لیے اپنی اسی جستجو میں انہوں نے ایک اہم فیصلہ کیا کہ وہ محل چھوڑ کر ریاضت کے لیے ویران جنگل میں جائیں گے۔

ازدواجی زندگی کے تقریباً دس سال بعد گوتم کے ہاں ایک بچہ ہوا، جس کا نام رہل رکھا گیا۔ اس رات سارے محل میں جشن منائے گئے، لیکن گوتم کے ذہن میں وہ سوالات رقص کر رہے تھے، ان میں حق کی تشنگی بڑھتے جا رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اسی رات اپنا گھر، خوشیاں اور پر تعیش زندگی میں میسر تمام نعمتیں چھوڑ کر راہبانہ زندگی اختیار کر لی۔ جاتے ہوئے انہوں نے ایک الوداعی نگاہ اپنے بیوی بچے پر ڈالی اور نصف شب کے اندھیرے میں گھر سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر 29 سال تھی۔ شہر سے دور پہنچ کر انہوں نے اپنا شاہی لباس اور زیورات اتار دیے اور فقیر والا لباس پہن لیا، اپنے بالوں کو کاٹا اور ایک رازدار ملازم کے ذریعے اپنے والد کو تمام زیورات اور شاہی لباس پہنچا دیا۔ ہجرت کے اس واقعے کو بدھی اصطلاح میں مہاتیاگ (ترک عظیم) کہا جاتا ہے۔

محل سے ہجرت کے بعد گوتم دنیاوی مسرتیں چھوڑ کر انہوں نے ہندوستان کے مختلف فلسفیوں سے تعلیم حاصل کی مگر ان کی تشنگی باقی رہی۔ اپنی روحانی تشنگی بجھانے کے خاطر گوتم گھومتے گھومتے مشرقی ہندوستان میں موجود ایک جنگل میں پہنچے۔ وہاں انہیں پانچ تارک الدنیا ساتھی بھی انہیں مل گئے جو ان کے ساتھ مراقبے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے ایسی سخت ریاضت اور مشقتیں کیں کہ ان کا خوبصورت جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گیا تھا، اس عہد میں ریاضت کے لیے جو جو تکالیف اپنے جسم کو دی جاتی تھی گوتم نے وہ سب کیا حتیٰ کہ ان کی ہڈیاں اور رگیں نمایاں ہو گئیں تھیں اور آنکھیں اندر دھنس گئیں تھیں۔ گوتم نے یہ کٹھن ریاضتیں تقریباً چھ برس تک جاری رکھیں، لیکن انہیں ان ریاضتوں سے کچھ حاصل نہ ہوا تو انہوں نے یہ سخت ریاضت چھوڑ دی کہ اس طرح فاقہ کشی اور ریاضتوں سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اپنی حالت دیکھ کر خود گوتم کو یقین ہو گیا تھا کہ معتدالانہ زندگی چھوڑ کر جسم کو تکلیف دینا بے فائدہ عمل ہے اور اس سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ انہیں اس عملی تجربے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ جسمانی ریاضتوں سے اور بھوکا رہ کر سوائے تکلیف کے کچھ نہیں ملتا ۔چنانچہ انہوں نے اپنے نفس کی دیکھ بھال کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن گوتم کے اس فیصلے سے ان کے وہ ساتھی بیزار ہوئے کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ جسمانی تکالیف اٹھائے بغیر نجات حاصل کرنا ناممکن ہے۔ گوتم کے اس معقول اقدام سے ان پر یہی تاثر پڑا کہ گوتم دنیا کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا وہ گوتم کو چھوڑ کر بنارس کے کسی آشرم میں چلے گئے۔ گوتم بدھ کو یقین ہو گیا تھا کہ معتدلانہ زندگی چھوڑ کر جسم کو تکلیف دینا بے فائدہ عمل ہے اور اس سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نفس کی دیکھ بھال کرنے کا ارادہ کر لیا ۔لیکن گوتم کے اس فیصلے سے اس کے وہ ساتھی بیزار ہوئے کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ جسمانی تکالیف اٹھائے بغیر نجات حاصل کرنا ناممکن ہے۔

مہاتما گوتم کو خدا کی طرف سے بذریعہ خواب اشارہ ملا کہ جسم کو حد سے زیادہ تکلیف پہنچانا یا ریاضت چھوڑ کر دنیاداری میں کھو جانا دونوں غلط ہے۔ صحیح راستہ اعتدال اور میانہ روی کا راستہ ہے۔ اس الہام کے بعد گوتم نے اعتدال میں رہ کر ریاضت کرنے کا ارادہ کیا۔ چھ سال کی طویل مدت بعد انہوں نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور ایک چرواہنگی نذر کی ہوئی کھیر (یا دودھ) سے اپنی جسمانی ریاضت توڑی۔ ریاضت توڑنے کے بعد اسی شام گوتم نے ایک بار پھر مراقبے کا ارادہ کیا۔ اس دفعہ مراقبے میں ڈوبنے سے پہلے انہوں نے ٹھان لیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، چاہے جسم ختم ہو جائے، ہڈیاں گل جائے لیکن نروان حاصل کرنے تک مراقبہ ختم نہیں کرونگا۔ ان کا یہ ارادہ ان کے سابقہ مشاہدے سے متضاد نہیں تھا کیونکہ وہ اس بار اپنی جسمانی صلاحیتوں سے زیادہ خود پہ بوجھ نہیں ڈال رہے تھے، بلکہ وہ صرف حالت سکون میں رہ کر مراقبہ کرنا چاہتے تھے، اس جنون کے ساتھ وہ وہیں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے گھاس کی گدی بنا کر بیٹھے۔ انہوں نے اپنے تمام خیالات کو ایک نکتے پر مرکوز کر دیا اور غور و فکر میں ڈوب گئے۔

مراقبے کی حالت میں گوتم کو کافی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اسی حالت میں رہے۔ 49ویں دن انہیں معرفت حاصل ہوئی اور انہوں نے نروان حاصل کر لیا۔ اب وہ وہ سدھارتھ سے بدھ ہو گئے۔ بدھ دراصل سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی دانشمند، ہوشیار، بیدار، عارف، دانا اور روشن وغیرہ ہیں۔ بدھ مذہب کی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس نے معرفت الٰہی یعنی نروان حاصل کر لیا ہو اور وہ دنیا کے غم و نجات اور تاریکی سے نجات پا کر دوسروں کو روشنی کی طرف بلا رہا ہو۔ اس وقت ان کی عمر 35سال تھی اور تبھی سے انہیں بدھ یعنی عارف کہا جانے لگا۔ اب گوتم بدھ بنارس میں آسی پتن (موجودہ نام سرناتھ) کی جانب چل پڑے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ان پانچ درویشوں کو اپنا پہلا اپدیش (خطبہ) دیا۔ یہ خطبہ بدھ مذہب میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ جس کے ابتدائی کلمات یوں ہے۔

اے بھکشوؤ! دو انتہائیں ہیں جہاں کبھی مت جانا۔ وہ دو ایک یہ کہ عیش و عشرت کی زندگی اختیار کرلی جائے۔ یہ نہایت حقیر اور ذلت کی زندگی ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ اپنی زندگی کو ایذاء دیا جائے۔ یہ نہایت تکلیف دہ اور بے معنی چیز ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان راستہ تلاش کرنا چاہیے جو نجات اور بصیرت کا راستہ ہے۔ یہ راستہ نیک و اعتقاد، نیک نیت، نیک قول، نیک فعل، نیک کمائی، نیک کوشش، سکون اور سچ کا راستہ ہے جو نروان کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یہ درمیانی راستہ آٹھ پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ [1]

اس کے بعد گوتم بدھ نے اپنی تبلیغ جاری رکھی جس کی بدولت کئی نامور شخصیات، بادشاہ اور ان کے باپ، بیوی اور بیٹے نے ان کا مذہب قبول کرلیا۔ گوتم بدھ نے اپنے بھکشوؤں کو بھی اس بات کی ہدایت کی کہ وہ دور دراز علاقوں میں جائیں اور اس دھرم کی تعلیمات عام کریں۔ گوتم کی تعلیمات سرعت رفتار سے پھیل رہی تھی۔ گوتم بدھ کے ماننے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک گروہ وہ تھا جو گوتم کی تعلیمات اور دنیاداری دونوں کو ساتھ لے کر چل رہا تھا، جبکہ دوسرا گروہ دنیا سے ناطہ توڑنے والے درویشوں کا تھا۔ بدھ مت کی اصلاح میں اس دوسرے گروہ کے لوگوں کو بھکشو کہا جاتا ہے اور انہیں اجتماعی طور پر سنگھ کہتے ہیں۔ گوتم بدھ اپنی زندگی میں دونوں گروہوں کو کامیابی سے ساتھ لے کر چلتے رہے۔ اور اکیس سال تک اپنے مذہب کی تبلیغ میں سرگرم رہے، جس کے نتیجے میں بے شمار لوگ ان کے ہم خیال بن گے۔ تقریباً اسّی سال کی عمر میں ان کا انتقال کوشی نگر (ضلع گورکھپور میں موجودہ کاشی) میں ہوا۔

بدھ مت کی ابتدائی تاریخ

چونکہ یہ مذہب برہمنیت میں پائے جانے والے نقائص کی اصلاح اور اپنشد کے صوفیانہ خیالات کا حامی تھا اس لیے کئی برہمن تارک الدنیا لوگ اس میں شامل ہوئے۔ گوتم بدھ کی وفات کے کچھ عرصے بعد ہی بدھ مت اپنی منفرد تعلیمات اور خصوصیات کی بدولت ہندوستان کے تمام بڑے شہروں تک پہنچ چکا تھا، اور ان کی وفات کے بعد اس مذہب کی تبلیغ کی ذمہ داری سنگھ جماعت نے بخوبی نبھائی۔ چونکہ گوتم بدھ اپنی کوئی مقدس کتاب چھوڑ کر نہیں گئے تھے، نہ ہی اپنے مذہب کی باقاعدہ تدوین کی تھی، لہٰذا یہ کام ان کے انتقال کے فوراً بعد سنگھ نے کیا۔

عیسائیت سے متعلقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں اس مذہب کی کتب مقدسہ کی ترتیب و تدوین کے لیے کونسلیں منعقد کی گئی۔ یہی بدھ مت میں بھی ہوا۔ گوتم بدھ کی وفات کے بعد ان کے ایک پرانے اور اہم شاگرد مہاکسپ (Mahakasyapa) نے یہ تجویز دی کہ مہاتما بدھ کی دی ہوئی تعلیمات کو یکجا کرنے، ان کی تصدیق کرنے اور ان کی ضابطہ بندی کرنے کے لیے راج گڑھ میں ایک مجلس کا انعقاد کیا جائے۔ چنانچہ تمام بزرگوں کی ایک کونسل بلائی گئی۔ بدھ مت کی تاریخ میں ہمیں اس قسم کی چار کونسل کا ذکر ملتا ہے۔ پہلی کونسل بدھ

[1] یہ خطبہ بدھ مت کی مقدس کتاب "سمیتا نکایا" میں ہے۔

کے انتقال کے بعد ہوئی۔ اس مجلس میں گوتم کے خاص شاگردوں نے گوتم بدھ کی تعلیمات سنائی۔ انہی زبانی بیان کردہ تعلیمات کو ہی بعد میں بدھ مت کی مقدس کتاب ہونایا کا درجہ حاصل ہوا۔

اس کونسل کے بعد بدھ مت بھکشوؤں کی سرپرستی میں ہندوستان میں دوسرے مذہبی فرقوں مثلاً جین مت، ویدانت وغیرہ کی نسبت زیادہ تیزی سے پھیلنے لگا اور کئی لوگ اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آنے لگے۔ لیکن اس برق رفتار قبولیت کی وجہ سے ہر نظریہ و فکر کے لوگ اس میں شامل ہوئے اور گوتم بدھ کی تعلیمات چونکہ کسی تحریری صورت میں موجود نہیں تھی اس لیے اس سے متعلق کئی اختلافات رونماء ہونے لگے۔ یہ اختلاف کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ عیسائیت کی تاریخ میں برناباس اور ساؤل میں ہوا تھا۔ بدھ مت کے ماننے والوں میں سے ایک طبقہ گوتم بدھ بیان کردہ قوانین اور لفظی پابندی کا حامی تھا، جبکہ دوسرا طبقہ گوتم کی تعلیمات کی روح پر عمل کرنے کا علم بردار تھا۔ عام معنوں میں یہ طبقہ اجتہاد کا قائل تھا۔ ان اختلافات کے حل کے لیے 400یا380CE کے لگ بھگ میں بِہار کے شہر ویشالی میں دوسری کونسل منعقد کی گئی۔ اس کونسل میں روایت پسندوں کا زور زیادہ رہا۔ روایت پسند طبقے کی طرف سے آزاد خیال طبقے کی تکفیر کی وجہ سے سنگھ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ یہ بدھ مت میں تفرقے کی پہلی بنیاد تھی۔ روایت پرستوں کی جماعت "استھاویرا وادِن" کہلائی اور آزاد خیال لوگ "مہاسنگھکا" کہلائے۔ استھاویرا وادن اور مہاسنگھکا بعد میں تھیراواڈا اور مہایان کے نام سے مقبول ہوئے۔[1]

روایت پسندی اور آزاد خیالی کے اس اختلاف کے ازالے کے لیے 386BC ایک بار پھر کونسل بلائی گئی۔ اس میں روایت پسند طبقے کو کامیابی حاصل ہوئی اور مخالف خیال لوگوں کو ملحد قرار دے دیا گیا۔ روایت پسند طبقے کی طرف سے آزاد خیال طبقے کو کافر و ملحد قرار دینے کی وجہ سے سنگھ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ یہ بدھ مت میں تفرقے کی پہلی بنیاد تھی۔ بدھ مت کی ترویج و اشاعت میں اشوک بادشاہ (r.304-232BC) نے اہم کردار کیا ہے، آج بدھ مت کو جو بین الاقوامی مذہب کی حیثیت حاصل ہے وہ اشوک کی ہی خدمات کی بدولت ہوئی ہے۔ اسی بادشاہ کی کوششوں سے بدھ مت مذاہب عالم میں ایک الگ حیثیت سے سامنے آیا اور لوگوں سے اسے جوش و خروش کے ساتھ تسلیم کیا گیا۔

اشوک بادشاہ تیسری صدی قبل مسیح میں ہندوستان پر تخت نشین خاندان موریہ کا بادشاہ تھا۔ تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ اشوک ابتداء میں تشدد پسند تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کی توسیع کے ایک کئی جنگیں کیں، لیکن 261BC میں جب اس نے کلنگ (موجودہ اڑیسہ) پر حملہ کیا تو اس میں لاکھوں بے گناہ لوگ قتل ہوئے۔ اس واقعے کا اشوک کے دل پر گہرا اثر پڑا اور وہ امن پسندی کی طرف مائل

[1] Arnie Kozak, The Everything Buddhism Book, page96, USA: Everything Books, 2010

ہو گیا۔ ہندوستان میں اس وقت بدھ مت اہمسا (عدم تشدد) اور اپنی پر امن تعلیمات کی بدولت خاصا مقبول ہو چکا تھا، اشوک نے بھی یہ مذہب قبول کر لیا اور اسے سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ اس مذہب کی اشاعت کے لیے اشوک بادشاہ نے ہر ممکن اقدامات کیے۔ ملک کے طول و عرض میں مذہبی مبلغ سری لنکا، برما، جاپان، کشمیر، چین، نیپال، مصر، شام اور یونان وغیرہ میں بھیجے۔ لوگوں کو گوتم بدھ سے متاثر کرنے اور ان کی تعلیمات عام کرنے کے لیے اشوک نے کئی ستون اور کتبے بھی لگوائے جس میں گوتم بدھ کی تعلیمات درج کی گئیں۔ بدھ مت کی تاریخ میں ان کتبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اشوک چونکہ عمارتیں بنوانے کا شوق رکھتا تھا اس لیے اس نے بدھ مت سے متعلقہ تاریخی مقامات پر عمارتیں بنوائیں، بدھ مت کی عبادت گاہ، جو کہ اسٹوپا کہلاتی ہے، بھی اشوک نے ہی بنوائے۔ اشوک کے دور میں ہندوستان میں بدھ مت ایک عوامی مذہب بن چکا تھا۔

اشوک کے دور میں بھی گوتم بدھ ایک کونسل طلب کی گئی، جس میں اس مذہب کی تعلیمات کی تدوین عمل میں آئی۔ اس کونسل کا مقصد بھی یہی تھا کہ بھکشوؤں کے باہم ہونے والے اختلافات کو ختم کیا جائے اور بدھ تعلیمات کو از سر نو مرتب کی جائے۔ لیکن اس کونسل کا نتیجہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں آیا کہ سنبھکا جماعت کو بدعتی قرار دے دیا گیا۔ نیز اس کونسل میں بدھ مت میں شامل ہونے والے کئی غیر عناصر کو بھی خارج کرنے کی کوشش کی گئی۔ [1]

اشوک کی بیٹی سگھمتّا نے بدھ مت کے ماننے والی عورتوں کے لیے بھی خواتین بھکشوؤں کا ادارہ قائم کیا، اور اس کے بیٹے مہندر نے سری لنکا اور جنوبی ہند میں اس مذہب کی اشاعت کی۔ ان مبلغین کی کوششوں سے دوسری صدی قبل مسیح تک سری لنکا، ہندوستان اور برما میں بدھ مت کثرت سے پھیل چکا تھا۔ لیکن بدھ مت جہاں جہاں میں رائج ہوا وہاں کے لوگوں نے بدھ مت میں اپنے سابقہ عقائد اور روایات کو بھی نہ چھوڑا، چنانچہ اپنے فروغ اور اشاعت کے ساتھ ساتھ بدھ مت نے مذہبی معاملات میں کئی تبدیلیاں بھی قبول کیں۔ ہندوستان میں برہمنی طبقے نے اگرچہ شروع میں اسے ایک خطرہ سمجھا تھا لیکن عوام کی ایک بڑی تعداد نے اس مذہب کو قبول کر لیا تو گوتم بدھ کو بھی ہندو اوتاروں میں شامل کر لیا گیا۔

موریہ خاندان کے بادشاہ اشوک اور اس کے بعد اس کے جانشینوں کے سرپرستی میں بدھ مت نے ہندوستان میں مستحکم حیثیت اختیار کر لی تھی، لیکن موریہ خاندان کے زوال کے بعد ہندوستان میں کٹر برہمنوں کی حکومت قائم ہوئی اور ان کے کچھ بادشاہوں نے بدھ مت پر کئی مظالم ڈھائے اور کئی خانواہیں جلوا ڈالیں اور بھکشوؤں کو قتل کیا۔ لیکن اس بات کے آثار بھی ملتے ہیں کہ کئی علاقوں میں بدھ مت کے پیروکار امن کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور اپنے مذہب پر عمل پیرا تھے۔

[1] Le Huu Phuoc, Buddhist Architecture, Grafikol, 2010,

عیسوی صدی کے آغاز میں بدھ مت ہندوستان میں بہت ہی زیادہ مقبول مذہب تھا، اس کی اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے متعلقہ ہندوستان میں جتنی بھی مذہبی یادگاریں دریافت کی گئی ہیں ان میں زیادہ تر بدھ مت سے ہی تعلق رکھتی ہیں، ریاست اور معاشرے کے مقامی لوگوں کے کے عطیات کی وجہ سے خانقاہیں مالی اعتبار سے کافی مستحکم ہوگئی تھیں۔ بدھ مت اپنی پرجوش مبلغین کی کوششوں کی بدولت افغانستان اور ایران کی سرحدوں سے گزر کر آگے جارہا تھا۔

عیسوی دور سے قبل گوتم بدھ کی تعلیمات اب تک بدھ اساتذہ زبانی پڑھایا کرتے تھے، اسی طرح یہ تعلیمات گوتم بدھ کی وفات سے تقریباً 300سال تک سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہیں۔ پہلی صدی قبل مسیح میں ہونے والی یہ کونسل اس لحاظ سے انتہائی اہم ہے کہ اس کونسل میں بدھ مت کی مقدس تعلیمات کو پہلی بار پتوں پر ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کیا گیا اور بدھ مت کی مقدس کتابیں مرتب ہوئیں۔ اس کونسل میں دو اجتماع ہوئے۔ پہلا اجتماع سری لنکا میں اس وقت کے راجہ "وتہ گمانی "(r. 103-77 BC) کے سرپرستی میں روایت پسند طبقہ استھر اوادن (تھیرواڈ) کے زیر اہتمام ہوا اور اس میں بدھ مت کے مقدس صحائف کے ایک اہم حصے کو لکھا گیا۔ جبکہ دوسرا اجتماع کشن سلطنت کے راجہ کنشک(Kanishka 151–127 CE) نے کشمیر میں طلب کیا۔ یہ اجتماع "سرواستی واد" کے زیر اہتمام ہوا جو کہ جدت پسندوں کا نمائندہ فرقہ تھا۔

راجہ کنشک بدھ مت بدھ مت کا ایک خیر خواہ مانا جاتا ہے۔ اس کے دربار میں بدھ عالموں کی مجلس ہر وقت قائم رہتی تھی۔ گذشتہ کونسل کے برعکس یہ راجہ جدت پسند فرقے کا پیروکار تھا۔ کنشک کے دور بدھ مت کی مقدس کتابوں کی تفسیریں بھی لکھی گئیں جو تانبے کی سرخ چادروں پر کندہ کی گئی اور بعد میں نامعلوم وجوہات کی بناءپر انہیں استوپ میں دفن کر دیا گیا۔[1] پاکستان کے گندھارا تہذیب بھی اسی مکتب فکر کو نمایاں کرتی ہے۔ بہرحال اس کے بعد دونوں مکاتب اپنے اپنے طور پر بدھ مت کی تبلیغ کرتے رہے۔ جس کے نتیجے میں افغانستان کا بیشتر علاقہ بدھ مت کا پیروکار بن گیا۔ یہیں سے بدھ مت آس پاس کے وسطی ایشیائی علاقوں میں بھی پہنچا۔

اگر ہم قدیم بدھ صحائف کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مت کے ابتدائی پیروکار اپنے پیشوائے دین کو محض ایک بشر اور روحانی استاد کی طرح مانتے تھے، کسی بھی خطے میں ان کی پرستش کی سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، لیکن اس دور میں گوتم بدھ کو ایک دیوتا کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ اس کی وجہ کے متعلق مورخین کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرپائے ہیں تاہم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ رجحان غالباً بدھ مت میں دیوتا اور خدا کے واضح تصور کی عدم موجودگی اور اس وقت کے قدیم مذاہب کے اثرات تھے۔

[1] Raj Pruth, Buddhism And Indian Civilization, page 93, New Dehli: Discovery Publishing House, 2004

تھیرواڈ اور مہایان فرقے

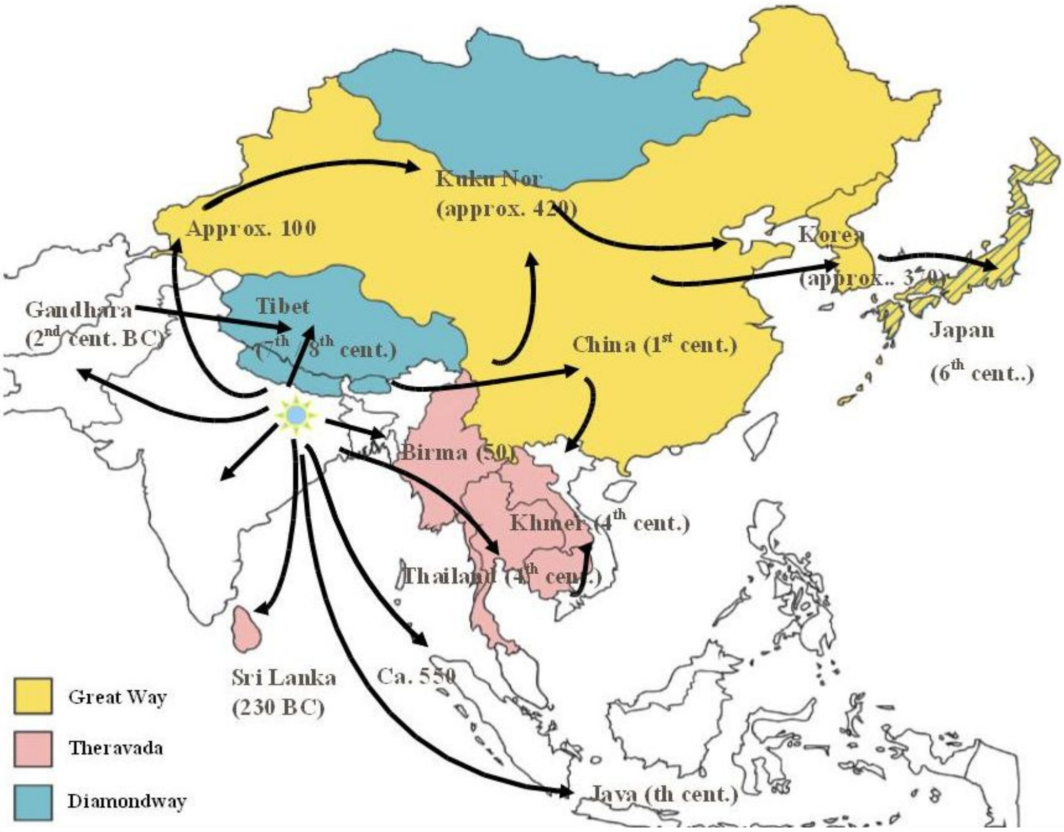
ان کونسلز میں اگرچہ کئی اختلافی مسائل کے فیصلے کیے گئے لیکن بدھ مت کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جارہا تھا اسی قدر اس میں مختلف خیالات کے لوگ شامل ہورہے تھے جس کی وجہ سے بدھ کے یہ دو فرقے بھی مزید تقسیم ہوتے گئے۔ بعد از مسیح کے دور میں بھی ہمیں مذہبی اختلافات بکثرت ملتے ہیں، دونوں فرقے کئی ذیلی فرقوں میں مزید تقسیم ہورہے تھے۔ان میں روایت پسندوں کا ترجمان تھیرواڈاور آزاد خیالوں کا مہایان فرقہ شروع ہوا جو آج بھی اسی سوچ کا علمبردار نظر آتا ہے۔ سن عیسوی کے آغاز کے زمانے میں مہایان فرقے کے عروج کا دور تھا۔ اس دور میں بدھ مت کو جو مہایان علماء ملے انہوں نے بدھ مت کو ایک بالکل ہی نئے انداز میں پیش کیا۔ اپنے مذہب کی متعلق ان کی تشریح انتہائی سادہ اور اُس دور کے ضروریات کے مطابق تھی، اس میں چین، نیپال، سری لنکا اور ہندوستان کے مقامی دیوتاؤں کو بھی جگہ دی گئی۔

آگے بڑھنے سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بدھ مت دو بڑے فرقوں کے متعلق یہ جان لیا جائے کہ اس وقت یہ دونوں فرقے کس انداز میں اپنے مسلک کو قوت بخش رہے تھے۔ تھیرواڈ بدھ مت کا روایت پسند طبقہ تھا، اس نے بدھ مت کی قدیم روایتوں کو لفظی پابندی کے ساتھ قائم رکھا ہوا تھا۔ نروان، معرفت، گیان اور دیگر بدھی روایات فلسفیانہ رجحان رکھنے والے ایک مخصوص طبقے کے لیے تو موزوں تھا جو دنیا سے کنارہ کش ہو کر فقیر بن سکتے تھے، لیکن عام لوگ جن کے لیے یہ سب ممکن نہیں تھا، وہ قدرتی طور پر مہایان فرقے کی جانب متاثر ہوئی جس میں روحانی امور کی نسبت ظاہری رسوم اور اس وقت کے عوامی خیالات کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اس دور میں ہندوستان میں اٹھنے والی بھکتی کا رجحان اور ہندو مت کا اثر بھی مہایان فرقے نے قبول کیا۔ تھیرواڈ فرقے نے گوتم کی سیرت میں موجود اخلاقی احکام کو اہمیت دے رکھی تھی، اس کے برعکس مہایان نے گوتم بدھ کی شخصیت کو اپنی توجہ کا مرکز بنایااور گوتم بدھ کے وجود کو ایک دیوتا کی حیثیت سے پیش کیا جو عقیدت اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے ضروری تھا۔ ساتھ ہی اس دور میں یہ عقیدہ بھی بہت زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ گوتم بدھ کوئی ایک شخص نہیں تھے جنہوں نے نروان حاصل کیا بلکہ کئی بدھ پہلے بھی گزر چکے ہیں جن میں سب سے پہلے امدھ بدھ تھے۔ یہ امِدھ بدھ آج بدھ مت میں پرستش کے لیے اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ فلسفی رجحانات میں مہایان فرقہ تقسیم در تقسیم ہوتا جارہا تھا، ریاضت، بھکشوؤں، اعلیٰ اخلاقی معیار کی اہمیت بتدریج ختم ہو رہی تھی، تاہم بدھاؤں پر ایمان اور ان سے عقیدت کے ذریعے اس فرقے نے خود کو مستحکم کر لیا تھا۔ تھیرواڈ کے نزدیک نروان اور معرفت حاصل کرنا انسان کی اپنی کوششوں پر منحصر ہے، یہ اصول اس فرقے میں آج تک سختی سے قائم ہے، دوسری طرف مہایان کا ماننا ہے کہ یہ تعبیر پیش کی کہ جو لوگ نروان حاصل کر چکے ہیں دنیا سے جانے کے بعد ان کی پرستش سے ان کا فیض حاصل کیا جاسکتا ہے اور انہی ہستیوں سے عقیدت کی

ذریعے انسان معرفت کی اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

مشرقی ایشیاء میں بدھ مت کی اشاعت

مہایان اور تھیرواڈ کی ان تمام تر گہما گہمی کے ساتھ بدھ مت چین اور وسطی ایشیاء میں بھی خوب پھیل رہا تھا۔ اگرچہ اس کے متعلق ابتدائی حالت پر تاریخ سے زیادہ روشنی نہیں پڑتی، تاہم یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اشوک کے دور میں جو مبلغین روانہ کیے گئے تھے انہوں نے یہاں بدھ مت ایک سطحی انداز میں متعارف کروالیا ہو گا ساتھ ہی ہندوستانی تاجروں کا بھی اس سلسلے میں اہم کردار رہا ہو گا۔ چین میں بدھ مت کے متعلق سب سے پہلی روایات 60BC کے لگ بھگ ملتی ہیں۔ جس کے مطابق یہاں کے بادشاہ مِنگ ٹی (58-75 CE) نے خواب میں ملی ایک بشارت کی بنا پر ہندوستان سے بدھ کے مجسمے اور بدھ کے ماننے والے دو ہندو عالموں کو بلوایا۔ بادشاہ نے مقدس کتابوں کے ایک اہم حصے کا ترجمہ کروایا اور اس مذہب کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسے قبول کر لیا۔[1]



بدھ مذہب کی اشاعت-http://www.diamondway-teachings.org/export/en/content/introductions/buddhism_spread.html (28 Feb 2013)

[1] Joseph Edkins, Chinese Buddhism, Page 89, London: Gorgias Press LLC, 2003

اگرچہ چین اب بدھ مت سے آشنا ہو چکا تھا، لیکن ابھی بدھ مت کو چین کے سرحدی علاقوں کے علاوہ کہیں مستحکم حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی، اس کی بنیادی وجہ چین کے قدیم مذہب کنفیوشس ازم اور تاؤمت تھے جس کے علماء نے چینی حکمرانوں کی جانب سے بدھ مت کی حمایت کی بھرپور مخالفت کی ہوئی تھی۔ہان خاندان کے زوال کے بعد جب تیسری صدی عیسوی میں منگول حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے بدھ مت کو سرکاری مذہب قرار دے دیا۔[1] اس دور میں چین میں بدھ مت تیزی سے ترقی کرتا رہا، حتیٰ کہ پانچویں صدی عیسوی تک چین کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار بن چکی تھی۔ لیکن چینیوں نے بدھ مت کے ساتھ ہی اپنی سابقہ روایتوں کو نہیں چھوڑا تھا، حتیٰ کہ کئی لوگ بیک وقت بدھ مت، کنفیوشس ازم اور تاؤازم کے پابند رہتے تھے۔ اس رجحان کا اثر بھی بہر حال چینی بدھ مت پر یقیناً ہوا۔

چوتھی صدی کے اواخر میں بدھ مت چین سے کوریا تک پہنچا،[2] کوریا چونکہ اس وقت چینی تمدن سے بہت زیادہ متاثر تھا، اس لیے اس مذہب نے کوریا میں بھی جلد ہی سرعت سے اپنا مقام بنالیا اور اکثریت کا مذہب بن گیا۔ کوریا کی حیثیت بدھ مت میں ایک ایسے ذریعے کی ہے جس سے بدھ مت جاپان تک پہنچا۔ جاپان میں بدھ مت اگرچہ ہندوستان، چین اور کوریا کے بعد پہنچا لیکن اسے بدھ مت میں اپنے علمی کام کی بدولت ایک انتہائی اہم مقام ملا ہوا ہے۔پانچویں صدی میں کورین بادشاہ سیونگ (r. 523–554) نے کوریا میں بدھ مت سرکاری مذہب قرار دیا اور یہاں اس مذہب کی اشاعت میں کوئی کثر نہ چھوڑی۔ اس بادشاہ نے ہندوستان سے کئی اہم کتب منگوائیں اور اپنے ملک میں کئی عبادت گاہیں بھی بنوائیں۔ بیرون ملک بدھ مت کی اشاعت میں بھی اس نے اہم کردار ادا کیا۔اس نے جاپان میں بدھ مت کی تبلیغ کی اور یہاں تحفے کے طور پر بدھ تبرکات بھی بھیجی۔[3] یہاں کا سابقہ مذہب شنٹوازم تھا، اس مذہب کے ماننے والوں نے اس نئے مذہب کی مخالفت کی لیکن چھٹی صدی عیسوی میں جب ایک شہزادہ شوٹوکوڈیشو (d. 612CE) نے بدھ مت قبول کر لیا تو اس مذہب کی اشاعت کو تقویت پہنچی۔ یہاں بدھ مت میں شنٹومت کے کئی دیوتا بھی شامل ہوگئے۔ کوریا کے لوگ چینی تمدن پر عمل کرنا باعث افتخار سمجھتے تھے، لہٰذا انہوں نے مقدس کتابوں کو چینی ذرائع سے ہی حاصل کیا اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ لیکن کوریا سے ہوتے ہوئے بدھ مت جب جاپان پہنچا تو یہاں کے لوگوں نے اپنی تہذیب و تمدن، فنونِ لطیفہ اور علمی صلاحیتوں سے بدھ مت کو بہت زرخیز کر دیا۔ نہوں نے مذہبی معاملے میں خود کو مکمل طور پر چینی ماخذ پر منحصر کرنے کے بجائے خود مذہبی کتابوں میں غورو

[1] Nan Huaijin. Basic Buddhism: Exploring Buddhism and Zen. York Beach: Samuel Weiser. 1997. p. 99.

[2] V. S. Bhaskar. Faith & philosophy of Buddhism. Page 189.Dehli: Gyan Publishing House, 2009

[3] Serinity Young. Buddhism.page 68. Newyork: Marshall Cavendish, 2006

حوض کیا اور کئی شروحات لکھیں۔ساتویں صدی عیسوی تک بدھ مت جاپان میں مستحکم ہو چکا تھا اور یہاں مہایان بدھ مت رائج ہوا۔

ہندوستان میں بدھ مت کی حالت

پانچویں صدی عیسوی تک پنجاب اور بنگال میں اس وقت بدھ مت اپنے عروج پر تھا۔[1] تاہم مدھیہ پر دیش میں بدھ مت کے اثرات نہ ہونے کے برابر رہے۔اس دور میں گپت خاندان کی رواداری کی وجہ سے برہمنوں اور بدھ بھکشوؤں کے درمیان تعلقات بھی خوشگوار ہی تھے۔خود سلطنت کے کئی عہدوں پر بدھ مت کے پیروکار ہوتے تھے۔بدھی بھکشو اکثر ہندو مذہبی محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔

گپت عہد کے اسی آخری دور میں ہندوستان میں بدھ مت کے وجریان نامی فرقے کا ظہور ہوا۔[2] دراصل اس دور میں جادو سے متعلق قدیم ترین تصورات دوبارہ اٹھ رہے تھے،ہندوستان میں موجود بدھ مت کے پیروکار اس چیز سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور بدھ مت کا ایک اور فرقہ وجریان بھی ابتداء ہوئی۔عام لفظوں میں اسے تانترک بدھ مت بھی کہا جاتا ہے،بدھ مت کی یہی صورت بعد میں تبت میں پھیل گئی۔اس فرقے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جھاڑ پھونک،روحانی کرشمے دکھانے،اور عجیب وغریب مظاہروں کے ماہر ہوتے ہیں۔

تبت میں بدھ مت کی اشاعت

تبت میں بدھ مت تقریباً ساتویں صدی عیسوی شہنشاہ سونگ تسن گامپو(Songtsän Gampo: 617-650)کے ذریعے پہنچا۔سونگ تسن گامپو کی شہزادیاں بدھ مت کی پیروکار تھیں لہٰذا وہ اپنے ساتھ اپنے آبائی ملکوں کے مذہب بھی لے آئیں۔اس طرح شہنشاہ بدھ مت سے متعارف ہوا۔غالباً اُس شہزادی کا تعلق بدھ مت کے مہایانی فرقے سے تھا،اسی وجہ سے بعد میں شہنشاہ نے اس مذہب سے متاثر ہو کر اسی مسلک کی اشاعت کی۔بدھ مت سے قبل یہاں کا مذہب بون تھا،اس لیے بون مت کے ماننے والوں کی طرف سے بدھ مت کی مخالفت بھی ہوئی۔اس نے ہندوستان سے ایک تانترک بدھ مت کے عالم پدم سمبھاوا کو بون عالموں سے جھاڑ پھونک،روحانی مناظر دکھانے،اور عجیب وغریب مظاہروں کے مقابلے کے لیے بلایا جو کافی کامیاب رہا۔اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور بون مذہب کے ماننے والوں کی مخالفت کے باوجود بدھ مت کو تبت میں ایک حد تک متعارف کروادیا۔اس کے بعد ساتویں صدی کے آخر میں جب تری سونگ دیتسن(r.755-797 or 804) بادشاہ بنا تو اس نے کئی تبتی لوگوں کو ہندوستان بھیجا تاکہ وہ بدھ مت کی تعلیمات سیکھ کر یہاں لوگوں میں اس کی تبلیغ کرسکیں۔اسی دور میں چین کے سرحدی علاقے لہاسا(موجودہ Shannan Prefecture) میں

---

[1] James Legge. A Record of Buddhistic kingdoms The Clarendon Press, Oxford (1886)

[2] John Powers. Introduction to Tibetan Buddhism.Page 254. USA: Snow Lion Publications, 2007

سامیے کے مقام پر بدھ مت کی عظیم خانقاہ قائم ہوئی۔ یہ خانقاہ اس دور میں بدھ بھکشوؤں کی علمی تربیت کی ایک اہم جگہ بن چکی تھی۔ تبت، ہندوستان اور چین کے دیگر حصوں سے کئی بھکشو یہاں بدھ مت کی تعلیم سیکھنے آیا کرتے تھے۔ بہر حال اس کے بعد اس خانقاہ میں ہندوستانی، تبتی اور چینی راہبوں نے مل کر بدھ مت کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی اپنی خدمات انجام دیں اور کئی کتابیں مرتب کیں۔[1]

ہندوستان اور وسطی ایشیاء میں بدھ مت کا زوال

بدھ مت ایک دور میں دنیا کا ایک اہم مذہب تھا۔ لیکن جس سرعت کے ساتھ اس مذہب کو فروغ ہوا اتنی ہی تیزی سے بدھ مت پر کئی علاقوں میں زوال بھی آیا۔ بدھ مت جو نیپال اور ہندوستان سے شروع ہوا تھا، اب وہاں ایک کمزور حیثیت اختیار کر گیا تھا، اس کے برعکس اس مذہب نے افغانستان، سری لنکا، تبت، برما، چین اور جاپان میں اچھی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وسطی ایشیاء میں پانچویں صدی عیسوی میں اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی بدھ مت کا زوال شروع ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (r. 13-23H/635-645) کے دور میں اسلام وسطی ایشیاء کے اُن سبھی علاقوں تک پہنچ چکا تھا جہاں بدھ مت رائج تھا، ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول بھی کر لیا تھا لیکن بدھ مت پوری طرح زوال کا شکار نہیں ہوا تھا۔ یہاں مسلم اور بدھ مت دونوں کے پیروکار ہی موجود تھے۔ مسلم تصوف کی ابتداء بھی اسی خطے سے ہوئی جس میں بدھ مت کی طرح مراقبے اور پیر کے احکامات کے مطابق اسی گرد زندگی گزارنے کا رجحان زیادہ تھا۔

ہندوستان میں بدھ مت کو بے دخل کرنے کا سبب ہندومت کا احیاء تھا۔ یہاں بدھ مت کا زوال اہم سبب اندرونی فرقہ بندی اور تصورِ خدا کی کمی رہی۔ کوئی بھی مذہبی تحریک خدا اور مذہبی عقائد کے واضح نظام کے بغیر زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی، ہندوستان میں بدھ مت کی اسی کمزوری کا فائدہ ہندومت نے اٹھایا اور دیوتاؤں کو خوبصورت اور رنگین انداز میں پیش کیا۔ ہندوستان کے بادشاہ مہر کل (r. 515-530) کو بدھ مت کی تاریخ میں اسے ایک جابر حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جس نے ہندوستان میں بدھ مت کی بیخ کنی کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے پُر امن بودھوں پر کئی مظالم کیے، اسٹوپا اور خانقاہوں کا جلا کر برباد کر دیا اور کئی بھکشوؤں کا قتل بھی کیا۔ لیکن ان مظالم کے باوجود بدھ مت یہاں سے مکمل طور پر نہیں نکلا تھا۔ ہندوستان میں بدھ مت کے انخلاء کا اہم سبب ہندومت ہی بنا۔ نویں صدی عیسوی میں ہندو برہمنوں کی جانب سے ہندومت میں کئی اصلاحات کی گئیں، رزمیہ داستانوں کے اہم کرداروں کی

[1] http://www.berzinarchives.com/web/en/archives/study/history_buddhism/buddhism_tibet/details_tibetan_history/history_early_period_buddhism_tibet/Part_1.html

پرستش اس دور میں عام ہونے لگی۔ اوتار کے عقیدے کی وجہ سے گوتم بدھ کو بھی ہندوؤں کے ایک اوتار کی حیثیت دے دی گئی۔ اس دور کے اہم ہندو عالم شنکر اچاریہ (788-820CE) نے ہندومت کی تدوین نو کی اور کئی بدھوں سے مناظرے کیے۔ انہوں نے برہمنی مت کو پھیلانے کے لیے کئی اور مبلغین بھی تیار کیے جنہوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد بدھ مت کو ہندوستان سے نکال دیا۔ اس طویل عرصے میں اگرچہ ہندومت اور بدھ مت پر ایک دوسرے کے گہرے اثرات مرتب کرے، حتیٰ کہ بدھ مت خود ہندومت میں ضم ہو گیا۔ نیز وقت کے ساتھ ساتھ بدھ مت بادشاہوں کی سرپرستی بھی ملنا ختم ہو گئی۔ بہت سے پیروکار ہجرت کرکے سرحدی علاقوں میں بس گئے اور بہت سے لوگ عام ہندو آبادی میں جذب ہو گئے۔ دوسری طرف اسلام کی آمد کے بعد باقی ماندہ بدھوں نے بالعموم مسلمانوں کا ساتھ دیا اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

قرون وسطی میں بدھ مذہب

بدھ مت برصغیر سے نکل کر موجودہ افغانستان، مشرقی ایران، ازبکستان، ترکی اور تاجکستان کے علاقوں تک پھیل چکا تھا اور مقامی روایات کے ساتھ زندہ تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں بدھ مت کے یہ سبھی علاقے امویہ سلطنت(661–750)اور اس کے بعد عباسی سلطنت(750–1258) کے زیر انتظام رہے۔ مسلم خلفاء نے بدھ مت کے پیروکاروں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی بخشی اور بحیثیت مجموعی یہ دور بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے اچھا رہا۔اس زمانے میں مسلمانوں اور بدھ پیروکاروں کا اہم رابطہ تاریخ میں خلیفہ المہدی(r. 775–785)اور اس کے بعد کے خلفاء سے ملتا ہے جب انہوں نے بلخ اور دیگر علاقوں کی خانقاہوں سے بدھ مت کے علماء کو بغداد میں واقع مشہور اکیڈمی "بیت الحکمت" آنے کی دعوت دی، ان علماء نے طب اور فلکیات کی کئی اہم کتابوں کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرنے میں معاونت کی۔ان میں سے کئی کتابوں کا ذکر مشہور مسلم ببلیوگرافر "ابن الندیم" نے اپنی "کتاب الفہرست" میں کیا ہے۔ اس زمانے میں بدھ آبادی کے ایک بڑے حصے نے اپنے آبائی مذہب کو خیر آباد کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

1000 سے 1500CE تک کا دور جنوب مشرقی ایشیاء میں بدھ مت کے فروغ کا دور تھا۔1000میں برمی قوم کے بانی انورہتا منسو (Anawrahta 1015–1078)نے تھیرواڈ مکتب فکر کو اپنے زیر اثر علاقوں میں خوب تقویت دی۔ جس کے نتیجے میں سری لنکا اور موجودہ برما میں یہ مکتب فکر مستحکم ہو گیا۔ اس خطے میں سب سے بڑی سلطنت خمیر (802–1431CE) تھی۔اس کے ابتدائی دو بادشاہ ہندومت سے تعلق رکھتے تھے البتہ کے بعد دیگر سبھی بادشاہ بدھ مت کے پیروکار رہے۔ خمیر سلطنت کے بادشاہوں نے کئی بدھ ستوپ اور خانقاہیں تعمیر کروائیں اور بدھ مت کے فروغ کے لیے جدوجہد کیں۔ ان میں بدھ مت کے دونوں ہی مکاتب فکر سے تعلق

رکھنے والے بادشاہ گزرے جنھوں نے اپنے اپنے مکاتب فکر کی ترویج کے لیے کام کیا تاہم یہاں کی اکثریت نے تھراواڈ بدھ مت کو بخوشی اپنایا۔ اس کے بعد "سکھو تھائی" سلطنت (1238–1583CE) کو تھیرواڈ بدھ مت کو اپنایا اور اس کی ترویج و اشاعت کی۔ حتیٰ کہ تیرہویں صدی میں تھیرواڈ بدھ مت کو تھائی لینڈ کا قومی مذہب قرار دے دیا گیا۔ اس مذہبی گہما گہمی میں بدھ مت کے ہاں کئی فرقے بھی پیدا ہو رہے تھے۔ بالخصوص جاپان میں بے شمار فرقوں کا ظہور ہوا لیکن پندرہویں صدی کے بعد بدھ مت بتدریج زوال پذیر ہوتا گیا۔

جنوب مشرقی ایشیاء کے علاوہ دیگر خطوں میں اس وقت منگول حکومت تھی۔ تیرہویں صدی میں چنگیز خان (r.1206 –1227) کے بعد اکثر منگول حاکموں نے تبتی بدھ مت کو قبول کیا۔ جس کی وجہ سے تبت میں بدھ مت کی جڑیں مزید گہری ہو گئیں۔ بدھ مت تبت میں اکثریت کا مذہب بن چکا تھا اور اس مذہب پر علمی کام شروع ہو چکا تھا۔ سترہویں صدی میں تبتی بدھ مت کی اہم کتاب "کنجُر" مرتب کی گئی۔ چنگیز خان کے علاوہ اکثر منگول حکمرانوں کے مسلمانوں سے تعلقات اچھے نہ تھے، انہوں نے مسلمانوں کے کئی علاقے فتح کر کے انہیں اپنے زیر تسلط لائے اور مسلمانوں کے خلاف قوانین نافذ کیے، جبکہ دوسری طرف عیسائیوں سے قریبی تعلقات قائم رکھے، البتہ ساتوے منگول بادشاہ غزن خان تخت نشین ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی اسلام لے آیا۔ [1]

بدھ مت کا زوال

تبت میں بدھ مت کے استحکام کے وقت ہی جاپان، انڈونیشاء اور ملائیشیاء میں بدھ مت کے زوال کا دور شروع ہو گیا۔ انڈونیشیاء اور ملائیشیاء میں اسلام ہندوستانی اور عرب مسلمان تاجروں کی وجہ سے پھیل چکا تھا، تاہم بعد میں یہاں اکثریتی مذہب بدھ مت کی جگہ اسلام نے لے لی۔ اسی طرح چین جس نے ماضی میں بدھ مت کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، آٹھویں صدی میں ہی یہاں اس مذہب کا تنزل کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ یہاں کا بادشاہ وُوتسنگ (r.814 –846) تاؤ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بودھوں پر کئی مظالم ڈھائے اور ان کی خانقاہیں تباہ کر دیں۔ اس کے بعد اگرچہ چین کو منگول کے بدھ حکمران نصیب ہوئے جن کے دور میں کئی بدھ مقدس کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ ہوا لیکن گیارہویں صدی میں کنفیوشس ازم اور شنٹوازم کے احیاء کی تحریک شروع ہوئی تو اہل چین اور جاپان کی اکثریت دوبارہ اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ گئی۔ جاپان میں اب بھی ایک بڑی تعداد بدھ مت کے پیروکاروں کی تھی لیکن 1868CE میں شنٹوازم کو جاپان کا قومی مذہب قرار دے دیا گیا۔ باقی اس دور میں چین میں بدھ مت کی جو ایک حیثیت قائم تھی وہ انیسوی صدی میں کمیونزم انقلاب کے نذر ہو گئی، عوام نے سیکولرازم کے قبول کیا اور بدھ مت یہاں زوال پذیر ہو گیا۔

---

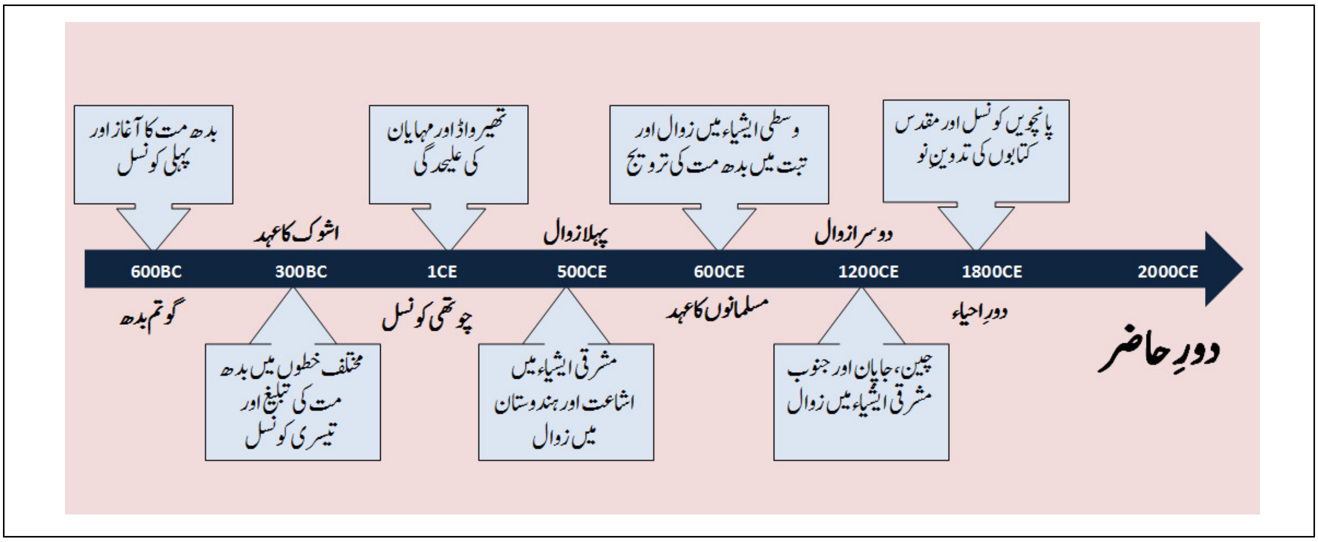
[1] الیگزینڈر برزن۔ مولف و ترجمہ: ڈاکٹر امجد علی بھٹی۔ صفحہ 186-187۔ لاہور: فکشن ہاؤس

دور جدید میں بدھ مذہب

انیسوی صدی تک بدھ مت تبت اور جنوب مشرقی ایشیائی علاقوں کے علاوہ اپنے دیگر تمام اہم مراکز میں بتدریج زوال پذیر ہو رہا تھا۔ چین اور جاپان میں اب بدھ مت کا زور ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت بدھ مت کے اہم مراکز تبت، تھائی لینڈ، برما، لداخ، کمبوڈیا، سری لنکا، سنگاپور اور اس خطے کے کچھ دیگر ممالک ہیں۔ دور جدید میں بدھ مذہب مغرب اور کئی ایسے ممالک میں پھیل رہا ہے جہاں کی قدیم مذہبی روایت اس سے مختلف ہیں۔ مغرب میں الحاد کے فروغ کے ساتھ ہی وہاں کے لوگوں کو بدھ مت میں دل چسپی ہوئی اور وہاں تبتی بدھ مت کی اشاعت ہوئی۔ بدھ مت میں ملحدین اور مغربی باشندوں کی دلچسپی کا سبب غالباً بدھ مت کا اخلاقی نظام اور خدا کا غیر واضح تصور ہے۔ اہل مغرب بدھ مت کی طرف راغب ہوئے تو انہوں بدھ مت کی مقدس کتابوں کا انگریزی ترجمہ کیا اور انیسوی صدی تک سبھی اہم کتب انگریزی میں منتقل کرلی گئیں۔ مغرب میں بدھ مت کی اشاعت کے لیے کئی سوسائیٹیز کا قیام عمل میں آیا ان کوششوں میں موجودہ دلائی لامہ (روحانی عالم) کی کوششیں انتہائی اہم ہیں۔ انہوں نے کئی مغربی ممالک کے دورے کیے اور بدھ مت کا درس دیا۔

برما میں 1871CE پانچویں بدھ کونسل تھیرواڈ کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ بدھ مت کے احیاء کے علاوہ اس کونسل کا اہم مقصد پالی مقدس صحیفوں پر نظر ثانی کر کے اسے از سر نو مرتب کرنا تھا۔ یہ کونسل صرف برمی بدھ بھکشوؤں کی زیر سرپرستی میں ہوئی تھی اور دیگر ممالک کی اس میں کوئی ترجمانی نہ تھی۔ لہٰذا1954CE میں دوبارہ ایک بڑی کونسل بلائی گئی جس میں اٹھارہ سے زائد ممالک کے 2500 علماء نے شرکت کی جس میں کئی پالی صحائف کو از سر نو مرتب کیا گیا۔ 1999CE میں دوبارہ ان صحائف پر نگاہ ڈالی گئی اور اس میں اسے غلطیوں اور الحاقات سے پاک کر کے نئے ایڈیشنز کے ساتھ شایع کیا گیا۔ دوسری جانب1960CE میں تبت میں بھی تبتی بدھ مت کے مقدس صحائف کو مرتب کیا گیا اور ان کا ترجمہ کیا گیا۔ دور جدید کو ہم بدھ مت کے احیاء کا دور کہہ سکتے ہیں۔ سری لنکا، برما، برطانیہ، امریکہ، تبت اور کئی ممالک میں بے شمار مذہبی ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جہاں نئی نسل کو بدھ مت کی تعلیم دی جاتی ہے ان اداروں کے طلباء مغرب میں بدھ مبلغین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔۔ ہندوستان میں نچلی ذات کے لوگوں کو بدھ مت کی طرف راغب کرنے کے لیے باقاعدہ تبلیغ ادارہ بنایا گیا ہے جس کی کوششیں کامیاب رہی ہیں۔ اسی طرح جرمنی اور بقیہ یورپ میں بدھ مت ابھرتا ہوا مذہب بن چکا ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں بدھ مت کو عیسائیت اور اسلام جیسے بڑے مذاہب کا سامنا ہے لیکن تمام مشکلات کے باوجود بدھ مت آج ایک زندہ مذہب ہے اور اسے دنیا کے چوتھے بڑے مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔

بدھ مت کی تاریخ کو اس ٹائم لائن کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:



کتب مقدسہ

بدھ مت کی وہ کتابیں جس پر اس مذہب کی بنیادیں استوار ہیں انہیں تری پٹک (تین ٹوکریاں) کہا جاتا ہے۔ یہ ساری کتابیں قبل مسیح کی عوامی زبان پالی میں ہیں۔

1۔ پہلی پٹک (ٹوکری) کا نام ونائے پٹک یعنی ہدایات کی ٹوکری ہے۔ یہ پٹک تین ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تالیف 360-250BC کے دور کی بتائی جاتی ہے، اگرچہ عوام اسے بدھ کی تعلیمات مانتی ہے لیکن بعض علماء کے مطابق یہ گوتم بدھ کے ایک شاگرد اپالی کے خطبات کا مجموعہ ہے کیونکہ اس مجلس میں انہوں نے یہ سنائی تھی۔ اس حصے میں وہ اصول وضوابط ہیں جو گوتم بدھ نے پروہتوں کے لیے مقرر کیے تھے۔

2۔ دوسری ٹوکری ستّاپٹک کہلاتی ہے۔ جس میں بدھ مت کے عام پیروکاروں کے لیے زندگی گزارنے کے اصول ہیں۔ یہ پٹک بھی کئی ذیلی کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ پٹک مجلس میں گوتم کے مشہور شاگرد دانند نے حاضرین کو سنائی۔ گوتم بدھ کی زندگی حالاتِ زندگی پر بھی یہ کتاب روشنی ڈالتی ہے۔

3۔ تیسری ٹوکری کا نام ابھیدم پٹک ہے جس میں نصف درجن سے زئد کتابیں شامل ہیں۔ اس پٹک میں ہمیں بدھ مت کے فلسفہ اخلاق اور مابعد الطبیعیات پر مبنی تعلیمات ملتی ہیں۔ اس حصے جو مجلس میں کسپا پانے سنائی۔

دھمّاپد (Dhammapada)

بدھ مت میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب دھمّاپد اگرچہ کھدکا نکایا کا ایک حصہ ہے لیکن چونکہ یہ کتاب مکمل طور پر گوتم بدھ

سے منسوب اقوال پر مشتمل ہے اس لیے اس کی اہمیت بدھ مت کی دیگر کتابوں کی نسبت زیادہ ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر اسے علیحدہ بھی شایع کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب تقریباً تیسری صدی قبل مسیح میں مرتب کی گئی۔ اس کتاب کا اردو، ہندی، انگریزی، جرمن، چینی، تھائی، تامل بنگالی اور کئی اہم زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔

تعلیمات وعقائد

اجمالی طور پر ہندومت اور بدھ مت کے عقائد میں زیادہ فرق نہیں ہے، ہندومت کی طرح بدھ مت میں بھی ایک خدا، متعدد دیوتا اور تناسخ اور کرما کا تصور موجود ہے اور ان سب کا ذکر ہم ہندومت میں کر چکے ہیں۔ اشوک کے کتبات میں ہمیں قیامت کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن پالی صحائف میں اس بارے میں کوئی واضح بات نہیں ہے۔ البتہ اس مذہب کی تعلیمات کا بنیادی محور یہ سب عقائد نہیں ہیں بلکہ اس کا بیشتر حصہ روحانی اور اخلاقی مباحث پر مشتمل ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات میں راہبانہ طرزِ فکر، اپنے نفس کی قربانی، ترکِ دنیا اور ریاضت و مراقبہ کی تعلیم نے لوگوں کے دلوں مسخر کیا ہوا ہے۔ ہمیں خدا، حیات بعد الموت اور آسمانی کتابوں کا تصور ضرور ملتا ہے لیکن اس کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ دراصل بدھ مت اُس دور میں ایک بہترین اخلاقی نظام کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا جس میں مذہبی عقائد کا زیادہ حصہ نہیں تھا۔ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے بدھ مت میں ہندومت اور مقامی مذاہب کے بیشتر تصورات دیوتا، تناسخ، کرم وغیرہ شامل ہوئے۔ ان سبھی تصورات کا ذکر ہم ہندومت میں کر آئے ہیں، اسے یہاں دوبارہ دہرانا غیر ضروری ہوگا۔ مراقبہ، ریاضت، غور وفکر، اخلاقی قوانین کی پیروی ہی وہ چیزیں ہیں جو گوتم بدھ کے مذہب میں اہمیت کی حامل ہے۔ لہٰذا عقائد کے ضمن میں ہم انہی تعلیمات کا جائزہ لیں گے۔

تصورِ خدا

بدھ مت میں خدا کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے، عام طور پر مذہبی ماہرین اس مذہب کو خدا کا منکر قرار دیتے ہیں، بعض مقامات پر ہمیں گوتم بدھ سے منسوب ایسے بیانات ملتے ہیں جس میں انہوں نے دیوتاؤں اور خدا کے متعلق کچھ منفی رائے دی ہیں لیکن ان کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو دھرم میں رائج تصورِ خدا کے متعلق ان کی تنقید ہے۔ ایک مذہبی رہبر کے متعلق یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی میں خدا کے متعلق مکمل طور پر خاموشی رکھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے ہمیں پالی صحائف میں گوتم بدھ کا خدا کے متعلق کوئی واضح بیان نہیں ملتا، محض اجمالی طور پر ملتا ہے۔ تاہم اشوک کے کتبات میں ہمیں خدا، روح، فرشتے اور قیامت وغیرہ کا ذکر زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ مہایان فرقے میں گوتم بدھ کو کم وبیش خدا کی ہی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے بدھ کے ساتھ

دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کی لازم قرار دی، اس کے برعکس تھیرواڈ فرقے نے ہستی باری تعالیٰ کے وجود کو باطل قرار دیا۔ انہوں نے گوتم بدھ کو اچاریہ منش یعنی ایک غیر معمولی صفات کا حامل انسان مانا۔

اخلاقی اور فلسفیانہ تعلیمات

اخلاقی اور فلسفیانہ تعلیمات میں گوتم بدھ کا مذہب دوسرے مذاہب سے منفرد ہے۔ اس مذہب کے مطابق انسان کے لیے نجات کی راہ صرف اخلاقی اصولوں کی پیروی اور فلسفیانہ طرزِ عمل ہے۔

1۔ چار سچائیاں

چار بنیادی سچائیاں بدھ مت کی بنیادی تعلیمات کی حیثیت رکھتی ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

- زندگی کی سب سے اہم حقیقت دکھ ہے۔ ہمیں زندگی میں بیماری، پریشانی، بڑھاپا اور کئی قسم کے دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
- زندگی میں جو کچھ بھی پریشانی، غم وغیرہ آتے ہیں ان کی ایک اہم وجہ انسان کی خواہش اور آرزو ہے۔
- اگر دنیا میں کوئی دکھ، مصائب اور پریشانی ہے تو اس کا سبب یقینا خواہش اور آرزو ہے جسے ختم کر کے ہی دکھوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
- آخری سچائی یہ ہے کہ دکھوں سے نجات کے لیے خواہشِ نفس کو ختم کرنا اور خواہش نفس کو ختم کرنے کے لیے آٹھ پہلوؤں پر مشتمل راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔[1]

ان آٹھ پہلوؤں کی تفصیل یہ ہے۔

- صحیح نقطہ نظر: اس سے مراد انسانی زندگی کے متعلق گوتم بدھ کے نقطہ نظر کو ماننا ہے۔ دوسرے مذاہب کے عقائد اور نجات کے طریقے اس ضمن میں صحیح نقطہ نظر نہیں مانے جاسکتے۔
- صحیح نیت اور خیالات: اس سے مراد وہ انسانیت سے متعلق وہ خیالات ہیں جو نفرت، غصہ، خواہش، تشدد، خود غرضی سے پاک ہوں اور جس میں انسانی ہمدردی، محبت اور ایثار شامل ہو۔ اس سلسلے میں بدھ مت میں میترا یعنی رحم اور محبت، کرن یعنی ہمدردی اور اہمسا یعنی عدم تشدد کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔
- صحیح گفتگو: اس اصول کے مطابق خود کو ایسی گفتگو سے بچائے رکھنا ہے جس میں کسی بھی قسم کا شر ہو۔ جھوٹ، فضول گوئی،

۔[1] Kedar Nath Tivari, Comparative Religion, page 47, Dehl: Motilal Banarsidass Publ., 1983

غیبت، چغل خوری اور فحش گوئی سمیک واک کے خلاف ہے۔اس کے بجائے راست گوئی، خوش اخلاقی، نرم گفتاری اور صدق بیانی وہ اصول ہیں جو صحیح گفتگو میں شامل ہے۔

- صحیح عمل: اس اصول کے تحت ان پانچ چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے: جھوٹ، کسی جاندار کا قتل، جنسی بے راہ روی، چوری اور نشہ آور چیزوں کا استعمال۔
- کسب حلال: اس سے مراد حلال روزی کھانا ہے۔ ظلم، دھوکہ، فریب، چوری اور کسی کی حق تلفی سے ملنے والا رزق اس اصول کی خلاف ورزی ہے۔اس ضمن میں پالی صحائف کے مطابق گوتم بدھ نے خود پانچ پیشوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ (ا) اسلحہ کی خرید و فروخت سے متعلق پیشے۔ (ب) جانوروں کی جان لینے اور ان کے گوشت یا کھال وغیرہ سے متعلق پیشے۔(ج) نشہ آور چیزوں کا کاروبار۔(د) غلاموں کی خرید و فروخت۔ (ہ) زہر کی خرید و فروخت۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ پانچ پیشے بدھ مت کے دنیاوی طبقے کے لیے منع ہے جبکہ بھکشوؤں کے لیے کسی بھی قسم کا کاروبار یا روزی کمانے کا طریقہ ممنوع ہے۔وہ صرف بھیک مانگ کر ہی گزارا کر سکتے ہیں۔
- صحیح کوشش: اس سے مراد اپنے ذہن میں بدھ مت کے پسندیدہ جذبات وخیالات پیدا کرنے اور بُرے خیالات کو باہر نکالنے کی جدوجہد کرنا ہے۔جب تک انسان میں برائی کے خیالات نہیں جاتے تب تک یہ کوشش جاری رکھنی چاہیے۔
- صحیح فکر: اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کے متعلق کسی بھی لاپرواہی سے بچتے ہوئے ہر وقت اپنے خیالات، جذبات، اعمال، گفتگو وغیرہ پر متوجہ رہے۔ کوئی بھی عمل یا گفتگو بے سوچے سمجھے نہ کرے ہر وقت جس کام میں بھی مشغول ہو اس کے متعلق مذکورہ بالا اصولوں کو مد نظر رکھے۔[1]
- مراقبہ: یہ بدھ مت کی سب سے اہم عبادت ہے، جس کے بغیر نروان (نجات) حاصل کرنا کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے۔

ہشت پہلو میں جو اصول بتائے گئے ہیں ان کی حیثیت دراصل معاون اسباب کی ہے اور ان سبھی کا مقصد یہی ہے کہ انسان مراقبہ کرتے ہوئے نروان حاصل کرلے۔اس کا تفصیلی ذکر ہم عبادت کے زمرے میں کریں گے۔

2۔ بدھی ستوا: یہ عقیدہ بدھ مت کے مہایان فرقے کا ہے۔ اس عقیدے کے مطابق گزرے ہوئے بدھاؤں کے جانشین مخلوق کی رہنمائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ اپنے مراقبے کے ذریعے نروان حاصل کرنے کے مستحق ہو چکے ہوتے ہیں لیکن مخلوق سے ہمدردی اور ان کی رہبری کے لیے وہ یہ عہد کرتے ہیں کہ جب تک ساری مخلوق نروان حاصل نہ کرلے تب تک خود بھی نروان حاصل

---

[1] Bhikkhu Bodhi, The Noble Eightfold Path: The Way to the End of Suffering, http://www.accesstoinsight.org

کرکے بدھ نہیں بنیں گے۔ یہ ہستیاں مہایان بدھ مت کے ہاں بدھی ستوا کے نام سے جانی جاتی ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں کائنات میں بہت سے تصرفات حاصل ہیں۔ مہایان کے ہاں ان بدھی ستواؤں کی پرستش بھی کی جاتی ہے، ان کے مجسمے بنائے جاتے ہیں اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق یہ بدھی ستوا ان کی نجات کے لیے قربانی دیتے ہیں۔

3۔ کرما: لفظی معنی کام یا عمل کے ہیں۔ اس عقیدے کے مطابق ہر جاندار کی زندگی پر اس کے اپنے اعمال کا اثر انداز ہوتے ہیں، خصوصاً دکھ اور پریشانی کا سبب ہمیشہ انسان کے اپنے ہی برے اعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس عقیدے کے مطابق ضروری ہے کہ انسان پہلے اچھے کرم اور دکھ سے نجات پائے کیونکہ موجودہ دنیا کے دائرۂ تکلیف میں رہتے ہوئے نجات (نروان) حاصل کرنا ناممکن ہے۔

4۔ بدھی: اس عقیدے کے مطابق گوتم بدھ، بدھ مت کے پہلے بدھ ضرور تھے لیکن ان کے بعد بھی کئی لوگ نروان حاصل کرکے بدھ کا مقام حاصل کرچکے ہیں۔ چنانچہ اس مذہب کے پیروکار نہ صرف گوتم بدھ بلکہ اور بدھوں کے طریقے کی بھی پیروی کرتے ہیں۔

نظام عبادات

عام طور پر بدھ مت میں وہی عبادات اور مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں جو ہندومت میں ہیں، یعنی پوجا، دیوی دیوتاؤں کی حمد وثناء وغیرہ۔ تاہم بعض فرقے اس سے مستثنیٰ ہیں جو خدا یا دیوی دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتے۔ بدھ مت میں بنیادی طور پر جس عبادت کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ مراقبہ (Meditation) ہے۔

مراقبے میں کوئی انسان ماحول اور دنیاوی حیات سے ماوراء ہو کر غور و فکر کی انتہائی گہری حالت میں غرق ہو جاتا ہے اور سکون و فہم حاصل کرتا ہے۔ عام الفاظوں میں اس سے مراد آنکھیں بند کرکے، دماغ کو تمام دنیاوی خیالات سے پاک رکھتے ہوئے اپنا دھیان کسی ایک نقطے پر مرکوز کرنا ہے۔ بدھ مت میں کئی قسم کے مراقبوں کا ذکر ہمیں کتابوں میں ملتا ہے۔ مراقبہ کی روایت ہمیں بدھ مت کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں بھی ملتی ہے۔

نظام معاشرت

روایات کے مطابق گوتم بدھ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے پیروکاروں کو دو گروہوں میں تقسیم کرلیا تھا: ایک دنیادار اور دوسرا راہبوں کا طبقہ۔ گوتم بدھ نے معاشرے کے ان دونوں طبقات کے لیے علیحدہ علیحدہ طرزِ عمل کی تعلیم دی۔

راہب یا بھکشو

اس گروہ میں شامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص کسی متعدی مرض میں مبتلاءنہ ہو، کسی کے غلام یا مقروض نہ ہوں، اپنی زندگی وقف کرنے کے متعلق والدین سے اجازت لی ہو۔ اس کے علاوہ اس طبقے میں شامل ہونے کے لیے سائل کو سر منڈوانا پڑتا ہے اور نارنجی رنگ کے کپڑے پہن کر گوشہ نشینی اختیار کرنی ہوتی ہے۔ بھکشو بننے کے بعد اب اس شخص کے لیے سوائے بھیک مانگنے کے، روزی کے تمام دروازے بند ہوتے ہیں۔

اس بھیک کے بھی کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ ایک بھکشو کسی سے زبردستی بھیک وصول نہیں کر سکتا۔ وہ صرف لوگوں کے گھر کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے، گھر والے جھولی میں کچھ ڈال دیں تو لے لیتا ہے ورنہ آگے چلا جاتا ہے۔ جب کھانے کی اتنی مقدار مل جائے جو اس کے زندہ رہنے کے لیے کافی ہو، تو پھر وہ اپنی قیام گاہ کو واپس لوٹ جاتا ہے۔ ایک بھکشو کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی تمام زندگی صبح صادق کو اٹھ کر خانقاہ میں جھاڑو دے اور پھر کچھ وقت کے لیے طہارتِ قلب کے حصول کے خاطر ذکر میں مصروف ہو جائے۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کے عیش و آرام یا سہولت پسندی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کا مقصد حیات صرف علم حاصل کرنا، اسے پھیلانا اور نروان پانا ہوتا ہے۔

دنیادار

ان لوگوں کو بھکشوؤں کے برعکس دنیاوی کاموں میں مشغول رہنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ لوگ اوپر بیان کردہ اصولوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تاہم ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رزق میں سے روزانہ بھکشوؤں کے لیے کچھ حصہ نکال لیں۔ یہ لوگ بھی جب چاہیں، بھکشوؤں میں شامل ہو سکتے ہیں۔

راہِ نجات

بدھ مت میں انسان کی زندگی کا مقصد نروان کا ہی حصول ہے۔ جن تذبذب اور روحانی بے چینی سے گوتم بدھ گزر رہے تھے اس سے گوتم بدھ کو نجات نروان پا کر ہی ملی۔ بدھ مت کے مقدس صحائف کے مطابق نروان ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان کی عقل سے ماورا ہے اسی لیے اسے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم بدھ بھکشو، علماء اس بارے میں جو تفصیل بتاتے ہیں وہ یوں ہے۔

نروان، جسے پالی زبان میں نبھان کہتے ہیں، کے معنی ختم ہونے کے ہیں۔ بدھ اصطلاح میں اس سے مراد ہندو مت کی ہی طرح سمسارہ یعنی بار بار جنم لینے کے چکر کو ختم کرنا یعنی اس سے نجات حاصل کرنا ہے۔ عام طور اس سے مراد نجات لیا جاتا ہے۔ جو شخص نروان

حاصل کرلیتا ہے اُسے ارہت کہتے ہیں اور ارہت مختلف مراحل سے گزر کر نروان کے بعد جس اعلیٰ ترین مقام پر پہنچتا ہے، اسے بدھی کہتے ہیں۔عام طور پر یہ لفظ نروان کے مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

بدھ مت کی تعلیمات کے مطابق نروان ہی کے ذریعے انسان تمام مصائب سے نجات پا کر ابدی مسرت حاصل کر سکتا ہے۔چونکہ نروان کی حقیقت کے بارے میں یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ انسان کا ذہن اس کا ادراک نہیں کر سکتا لہٰذا یہ بتانے کے بجائے کہ نروان کیا ہے، اس کی متضاد صورت کو واضح کیا جاتا ہے کہ نروان میں کیا کیا نہیں ہے۔ایک جگہ نروان کی حقیقت گوتم بدھ نے یوں بیان کی ہے:

"بھکشوؤ! یہ ایک ایسی کیفیت ہے جہاں نہ تو خاک ہے نہ پانی ہے، نہ آگ ہے نہ ہوا ہے، نہ لامکانیت ہے نہ شعور کی لامحدودیت، وہاں نہ تو عدم شعور ہے اور نہ ہی غیر عدم شعور، وہ مقام نہ تو یہ دنیا ہے اور نہ ہی دوسری دنیا، وہاں نہ سورج ہے نہ چاند، اور ہاں بھکشوؤں! وہاں نہ آنا ہے نہ جانے (کا تصور) ، نہ ٹھہرنے کا اور نہ گزرنے (کا تصور) نہ وہاں پیدا ہونا ہے۔(وہ مقام) بغیر کسی سہارے، بغیر کسی حرکت یا بنیاد کے ہے، بے شک یہی دکھوں کا خاتمہ نروان ہے۔"[1]

فرقے

دیگر مذاہب کی طرح بدھ مت بھی اپنی ابتداء سے ہی تفرقہ کا شکار ہوا۔ گوتم بدھ کی وفات سے کچھ عرصہ بعد ہی ان کے پیروکاروں میں مختلف نوع کے اختلافات اٹھ گئے تھے جس کے حل کے لیے کئی بار مجالس منعقد کی گئیں لیکن ان سبھی مجالس میں کسی نہ کسی فرقے کو بدھ مت سے خارج ہی قرار دیا گیا۔ بدھ مت کے ابتدائی دور میں کئی فرقوں کا ظہور ہوا اور وہ خود ہی ختم یا کسی دوسرے فرقے میں ضم ہو گئے اس کے علاوہ جس علاقے میں بھی بدھ مت گیا وہاں اس کی ایک الگ صورت بن گئی جو بعد میں ایک فرقے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ نیز فلسفیانہ فکر کے مختلف انداز نے بھی بدھ مت میں کئی فرقے پیدا کیے۔ یہاں ہم بنیادی تقسیم کے اعتبار سے دو فرقوں کا ذکر کر رہے ہیں لیکن واضح رہنا چاہیے انہی دو فرقوں کے تحت بے شمار فرقے اور بھی آجاتے ہیں۔ دیے گئے ٹیبل میں اس کی وضاحت ہے۔

تھیرواڈ

تھیراواڈ کے معنی بزرگوں کی تعلیم ہے۔ یہ فرقہ قدامت پسند خیال کیا جاتا ہے۔ اس فرقے کے مطابق زندگی کا مقصد نروان حاصل کرنا ہے۔ یہ لوگ بدھی ستوا پر یقین نہیں رکھتے، ان کے نزدیک ہر ایک کو ذاتی طور پر خود نروان حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرنا چاہیے۔ اس فرقے کے پیروکار سری لنکا، تھائی لینڈ، لاؤس، برما اور کمبوڈیا میں کثرت سے ہیں۔

---

[1] کھدک نکائے۔اُدان، 1 تا 8-(http://www.accesstoinsight.org/ptf/dhamma/sacca/sacca3/nibbana.html)

مہایان

یہ جدت پسندوں کا فرقہ ہے۔اس مذہب میں بدھی ستیوا کا عقیدہ رائج ہے،اس کے پیروکار زیادہ تر تبت، منگولیا، کوریا، جاپان، ویتنام اور چین میں عام ہیں۔ یہ فرقہ ہر علاقے میں اپنی اپنی روایات کے مطابق مختلف ہے، ہر علاقے میں مہایان کا ایک الگ مکتب فکر ہے۔ تاہم بنیادی طور پر یہ تقسیم مشرقی ایشائی مہایان اور تبتی مہایان پر کی جاتی ہے۔ جاپان میں بدھ مت کی صورتزین بھی مہایان کا ہی ایک مکتب فکر ہے۔اسی طرح تبت میں لامائی اور تانترک بدھ مت بھی اسی کی شاخ مانی جاتی ہے۔

تانترک بدھ میں جادوٹونے، کرشموں اور اس نوعیت کی چیزوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور یہ زیادہ تر تبت کے علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔

تہوار

بدھ مذہب میں کئی تہوار رائج ہیں مگر ویساکھ، مگھاپوجا اور اسھلاپوجا کے تہوار زیادہ مشہور ہیں۔

1۔ ویساکھ: ویساکھ کا دن گوتم بدھ کی پیدائش، حصول معرفت اور ان کی وفات سے منسوب ہے۔اس دن خاص پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ تہوار عموماً مئی کے پورے چاند کی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ ویساکھ یا بیساکھ ہندی کیلنڈر کا ایک ماہ ہے اسی ماہ کے نام پر یہ تہوار بدھ مت میں رائج ہے۔

2۔ مگھاپوجا: یہ تہوار قمری کیلنڈر کا تیسرا مہینہ (مارچ) کو منایا جاتا ہے۔ یہ تہوار اس واقعے کی یاد میں منایا جاتا ہے جب گوتم بدھ کی زندگی میں ایک بار ان کے 1250 شاگرد اتفاقاً ایک ساتھ اپنے استاد کا لیکچر سننے اور ان سے ملنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ یہ اس دن گوتم بدھ نے اپنی وفات کی پیشین گوئی بھی کی۔اس تہوار کے موقع پر گناہوں سے بچنے اور نیکی کرنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

3۔ اسھلاپوجا: یہ تہوار گوتم بدھ کے مشہور بنارس کے اپدیش کی یاد میں منایا جاتا ہے۔اس روز گوتم بدھ نے بنارس میں اپنے خاص پانچ درویش ساتھیوں کو خطبہ دیا تھا جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ یہ تہوار جولائی میں منایا جاتا ہے۔

اسائن منٹس

1. بدھ مت میں راہبوں اور دنیاوی طبقے کی تقسیم ہے۔اس تقسیم پر تبصرہ کیجیے۔
2. بدھ مت کے زوال کے اہم اسباب کیا رہے؟
3. گوتم بدھ کی تعلیم کا محور کیا تھا؟

باب 5: الحاد

دنیائے مذاہب میں بنیادی طور پر دو قسم کے عقائد سبھی کے ہاں کچھ اختلافات کے ساتھ یکساں طور پر موجود ہیں: وجود خداوندی اور فرستادگانِ خدا کا تصور جسے رسول، نبی، پیغمبر، تیر تھنکر، بدھ اور اوتار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان دونوں عقیدوں کا ماحصل یہ ہے کہ اس کائنات کو خدا نے تخلیق کیا ہے اور تخلیق کرنے کے بعد وہ اس کائنات سے لاتعلق نہیں ہو گیا بلکہ اس کائنات کا نظام وہی چلا رہا ہے۔ اس نے انسانوں کو اچھے اور برے کی تمیز سکھائی ہے اور یہ شعور اس کے نفس میں رکھ دیا، جسے فطرت کہتے ہیں۔ مزید بر آں خدا کی طرف سے چند عملی نمونے بھی ایسے آئے جن کے مطابق انسانوں کو اپنی زندگی گزارنا چاہئے۔ چند ایک مذاہب کو چھوڑ کر سبھی اہم مذاہب میں آخرت کا تصور بھی ہے جس کے مطابق اچھے اعمال کرنے والوں کے لیے جنت اور برے اعمال کرنے والوں کے دوزخ ہے۔

مذہب کے متعلق ان عمومی عقائد کے علاوہ ایک اور طرزِ فکر رائج رہا ہے جسے الحاد یا عموماً لادینیت کہا جاتا ہے۔ الحاد درحقیقت کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک طرزِ فکر کا نام ہے جو خدا، رسالت اور آخرت پر یقین نہ کرنے سے متعلق ہے۔ الحاد سے تعلق رکھنے والوں کو ملحدین کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا، دیوتا یا مافوق الفطرت ہستیوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لہٰذا ملحدین کے نزدیک مذہب بھی کوئی الہامی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ انسان کی اپنی سوچ و فکر کا نتیجہ ہے۔

دورِ حاضر میں الحاد کی تین بڑی قسمیں ہیں جنھیں مروجہ اصطلاحات میں Deism، Agnosticism اور Atheism کہا جاتا ہے۔

- ایتھ ازم (Atheism) سے مراد یہ ہے کہ خدا کے وجود کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔
- ڈی ازم (Deism) کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو عقل کی بنیاد پر مان تو لیا جائے لیکن رسالت کا انکار کیا جائے۔
- ایگنوسٹی سزم (Agnosticism) کو لاادریت بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خدا ہے یا نہیں۔

ان تینوں تصورات کا عملی نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے کہ انسان ہر قسم کے مذہب سے خود کو علیحدہ کر لیتا ہے۔ ڈی ازم میں اگرچہ خدا کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن انبیا کرام کی لائی ہوئی ہدایت سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایگنوسٹی سزم کے ماننے والے اگرچہ خدا کے وجود کا کھلا انکار تو نہیں کرتے مگر اقرار بھی نہیں کرتے۔

موجودہ الحاد کی تاریخ

خدا کے انکار کا یہ رجحان نیا نہیں ہے بلکہ ماضی کے ادوار میں بھی ہمیں بعض لوگوں کے ہاں یہ خیال ملتا ہے، زمانۂ قدیم سے ہی بعض لوگ کسی نہ کسی درجے پہ الحاد کے قائل تھے لیکن اس معاملے میں خدا کے وجود کا مطلق انکار بہت ہی کم کیا گیا۔ بڑے مذاہب میں بدھ مت کے ہاں خدا کا کوئی واضح تصور نہیں پایا جاتا، تاہم دیوتاؤں پر بدھ مذہب کے ماننے والے بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں صرف چند فلسفی ہی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے خدا کا انکار کیا۔ بعض نے اسے مختلف صورتوں میں تسلیم کیا ہے لیکن اس کی حیثیت صرف خالق کی مانی ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں خدا پر عدم یقین کا رجحان محض ذاتی خیال پر مبنی تھا اس میں سائنسی و تکنیکی وجوہات شامل نہ تھی، بلکہ جدید میں اس طرزِ فکر نے ایک منظم حیثیت حاصل کرلی ہے اور موجود الحاد سائنس پر مبنی ہے۔

الحاد کو حقیقی فروغ موجودہ زمانے ہی میں حاصل ہوا جب دنیا کی غالب اقوام مثلاً یورپ و امریکہ نے اسے اپنے نظام حیات کے طور پر قبول کرلیا اور اپنے تمام معالات سے مذہب کو بے دخل کردیا۔ موجودہ الحاد کی تحریک کی تاریخ ہم سولہویں صدی کے اختتام سے شروع کرسکتے ہیں۔ یورپ میں قرون وسطی میں کلیسا کے مظالم کے خلاف تحریکیں اٹھیں اور عیسائیت میں ایک نئے فرقے پروٹسٹنٹ کا ظہور ہوا۔ ان دونوں فرقوں میں کئی بار باہمی خانہ جنگی ہوئی، جب کوئی پروٹسٹنٹ حکمران ہوتا تو وہ کیتھولک پر مظالم کرتا اور جب حکمراں کیتھولک ہوتا تو پروٹسٹنٹ پر مظالم کرتا۔ یہ صورتحال عوام کو کے لیے مذہب سے بیزاری کا ایک اہم سبب بنی۔

اس کے ساتھ ہی اس دور میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا عمل شروع ہوا اور تعلیم تیزی سے پھیلنے لگی۔ اُس وقت مذہبی رہنماؤں کی جانب سے سائنس کی نئی دریافتوں بالخصوص کائنات کے متعلق ان سائنس دانوں کے پیش کردہ نظریات کے متعلق متشددانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ گلیلیو کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اعلان کرے کہ سورج زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ اطالوی فلسفی اور ماہر طبعیات جیور دانو برونو (1548-1600CE) پر بھی الحاد کے الزام میں مذہبی عدالت کی طرف سے مقدمہ چلایا گیا کچھ عرصے کی قید بامشقت کے بعد معافی مانگنے سے انکار کیا تو زندہ جلا دیا گیا۔ اسی طرح دیگر ماہرین فلکیات اور طبعیات کو بائبل کے خلاف ان کے سائنسی نظریات کی بناء پر سزائے موت دی گئیں جن میں نکولس کوپرنیکس(1473-1543CE) جیور جیس اگریکولا(1494-1555) جیسے جید سائنس دان شامل تھے۔

سائنسی علوم کے علمبرداروں نے جب عیسائیت کو منطقی اور عقلی میزان پر جانچنا چاہا اور عیسائیت کے بعض عقائد پر تنقید کی تو یہ مذہبی

طبقے کی جانب سے برداشت نہ کی گئی۔ اس معاملے میں عیسائیت سے وابستہ یہ دونوں ہی فرقے شدت پسند تھے، مذہبی انتہاء پسندی اس حد تک پہنچ گئی کہ کوئی بھی شخص جو مذہبی عقائد سے ذرا سا اختلاف بھی کرتا تو اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔ پروٹسٹنٹ نے اگرچہ عیسائیت کو پوپ کی غلامی سے آزاد اور کئی مذہبی اصلاحات نافذ کرکے عیسائیت کو روشن خیالی کی طرف گامزن کیا تھا لیکن اس بات پر وہ بھی تحمل نہ کرسکتے تھے کہ بائبل کے بیانات کو کوئی عالم عقلی طور پر غلط ثابت کر دے۔ کئی سائنسدانوں کو بائبل کے خلاف ان کے علمی نظریات کی بناءپر سزائے موت دی گئی۔ ان سائنس دانوں پر مذہبی رہنماؤں کے تشدد اور عیسائیت میں کیتھولک اور پرٹسٹنٹ کے باہمی خون ریزی کے نتیجے میں ناگزیر طور پر مذہب اور خدا کے متعلق بھی بہت سے لوگوں کی فکر متاثر ہوئی۔

کئی لوگ ان ساری صورتحال کی وجہ سے مذہب سے بیزار ہورہے تھے اور مذہب پر کھلی تنقید کررہے تھے۔اس تنقید میں سب سے زیادہ حصہ اُس دور کے فلسفیوں نے لیا۔ڈیکارٹ (Descartes 1596–1650) جو جدید فلسفہ کا بانی سمجھا جاتا ہے پہلا شخص تھا جس نے فلسفہ اور مذہب میں تفریق پیدا کی۔ اگرچہ وہ خدا کا قائل تھا لیکن وہ عقل پرستی کو فروغ دینے کا زبردست حامی تھا۔ اٹھارہویں صدی میں مشہور امریکی فلسفی ٹامس پائین (1737-1809)نے اپنی کتاب The Age of Reason شائع کی جس میں انہوں نے اپنے خیال کے مطابق عیسائیت کی خرابیوں اور بائبل کی غیر منطقی باتوں کو واضح کرتے ہوئے ان پر شدید تنقید کی۔ اس کے بعد ملحد فلسفیوں کی جانب سے مذہب پر تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس ضمن میں مشہور فلسفی کانتے(1798-1857)نے ایک خاص فلسفہ پیش کیا جو کہ "پازیٹوازم (Positivism)" کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے صرف ان چیزوں کا وجود تسلیم کیاجاتا ہے جو قابل مشاہدہ اور قابل ثبوت ہیں اور بقیہ چیزوں کے وجود کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالی کی ذات قابل مشاہدہ نہیں، اس وجہ سے اس کا انکار کر دیا گیا۔ کانتے کا یہ فلسفہ دورِ جدید کے الحادی نظام کی اہم بنیاد بنی۔ مذہبی علماءاور سائنس دانوں کی یہ خانہ جنگی مذہب اور سائنس کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کررہے تھے ۔ اس تشدد کی وجہ سے عقل پسند طبقے کے لیے مذہب اور اس سے وابستہ تمام امور قابل نفرت ہوچکے تھے۔ مذہب کے غیر ضروری عقائد، نفس کشی، عبادات اور دیگر تمام حدود سے وہ تنگ آکر باہر آنے لگے۔

اب تک اہل مذہب یہ دلیل پیش کرتے آئے تھے کہ کائنات کا وجود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا کوئی خالق موجود ہے۔ چارلس ڈارون(1809–1882) نے نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بے جان مخلوق سے خود بخود ایک جاندار خلیہ پیدا ہوا جو کہ لاکھوں سالوں میں ارتقاکے عمل سے گزر کر ابتدائی درجے کا جانور بنا اور پھر کروڑوں سالوں میں آہستہ آہستہ یہ مختلف جانوروں کی

صورت اختیار کرتا ہوا انسان بن گیا۔ اس کے بعد ملحد لوگ بالا علان مذہب سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے اور بہت سے سائنس دان و فلسفی خدا کی مختلف توجیہات پیش کرنے لگے۔

اسی دوران Deism کی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ خدا ہی نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے لیکن اس کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اب یہ کائنات خود بخود ہی چل رہی ہے اس تحریک کو فروغ ڈیوڈ ہیوم اور مڈلٹن کے علاوہ مشہور ماہر معاشیات ایڈم سمتھ (1790–1723) کی تحریروں سے بھی ملا۔ ان لوگوں نے بھی چرچ پر اپنی تنقید جاری رکھی اور چرچ کا جبر و تشدد جاری رہا۔ تقریباً دو سو سال تک یہ تحریک بھی مختلف شکلوں موجود رہی اور مذہب و سائنس کے درمیان جنگ جاری رہی۔ اٹھارہویں صدی میں کارل مارکس (1883– 1818) نے اشتراکیت کا نظام پیش کیا۔ اگرچہ یہ نظام معاش سے متعلق تھا لیکن اس کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ مذہب عوام کے استحصال کے لیے گھڑا گیا ہے۔ دیگر فلسفیوں کی طرح مارکس نے بھی مذہب پر کئی واضح تنقیدیں کیں لیکن ان کی تنقید کا محور بالخصوص یونانی فلسفی اور ان کا مذہب تھا۔ سائنس اور مذہب کے مابین اس جنگ میں سائنس کی جیت ہوئی اور علمی ترقی سے لوگوں پر یہ بالکل واضح ہو گیا کہ زمین کی پیدائش، نظام شمسی اور زمین کی ہیت کے بارے میں اہل مذہب کی آراء کس قدر غیر معقول ہیں، اس فکر کے رد عمل میں کلیسا کی طرف سے جو انتہائی درجے کا جبر و تشدد کا اختیار کیا گیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اہل علم میں بالعموم انکار خدا کی لہر چل نکلی جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

انیسویں صدی کے آخر تک الحاد مغرب میں اپنی مضبوط جڑیں پکڑ چکا تھا لیکن بیسویں صدی کے ہی نصف میں کئی ایسے علمی انکشافات ہوئے جنھوں نے وہ اکثر بنیادیں گرادیں جس پر ملحدین کے افکار قائم تھے۔ ملحدین یہ خیال کرتے تھے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن اسی صدی میں بگ بینگ تھیوری نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا۔ اس تھیوری کے مطابق کائنات توانائی کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں موجود تھی جو ایک بہت عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں مادے کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نظریے کو ماننے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مان لیا جائے کہ کائنات کا کوئی خالق ہے۔ لہٰذا ابتداء میں ملحد سائنس دان اور مفکرین نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن مزید سائنسی تحقیقات نے اس نظریے کو اس قدر تقویت دی کہ اسے ٹھکرانا ممکن ہو گیا۔ وہ قدیم نظریات جو الحاد کی بنیاد بن چکے تھے، رفتہ رفتہ سائنسی ترقی اور کائنات کے متعلق نئے انکشافات کی وجہ سے رد ہو رہے تھے۔ تجربہ گاہوں میں ڈارون کے نظریے پر جب تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تو یہ نظریہ کسی بھی طرح ثابت نہ ہو سکا بلکہ کئی شواہد اس کو رد کرنے کے لیے کافی تھے۔ کمیونزم کا وہ معاشی نظام جو مذہب کے خلاف ایک بہت بڑی تحریک بن چکی تھی، روس اور چین میں اس کے زوال کے ساتھ ہی الحاد کی بنیادی کمزور ہونا شروع ہو گئیں۔ ان ساری صورتحال کی وجہ سے بالعموم عقل پسند سائنس دانوں میں خدا کو ماننے کی تحریک

شروع ہوئی اور کئی بڑے سائنس دان اور فلسفیوں نے خدا کے وجود کو منطقی بنیادوں پر تسلیم کیا۔

ملحدین کے افکار

مذہب

مذہب کے انکار میں ملحدین کا نقطۂ نظر ہے کہ مذہب دراصل قدیم انسانوں کی ایجاد ہے جسے انہوں نے اپنے فہم سے بالاتر سوالوں کے جواب نہ ہونے پر ذہنی تسکین کے لیے اپنا لیا تھا۔ لیکن اب سائنس کی ترقی نے انسان کو وہ سب کچھ بتا دیا ہے جس سے وہ پہلے لاعلم تھا۔ مثلاً گزشتہ زمانوں کے لوگوں نے جب سورج کو ایک مخصوص وقت پر طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھا تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے پس پردہ ایک عظیم الشان اور مافوق الفطرت ہستی کے وجود کو تسلیم کر لیں۔ اسی طرح دیگر بہت سے سوالات جس کی بابت ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس کے متعلق انہوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ یہ اسی غیبی ہستی کا کارنامہ ہے۔ لیکن چونکہ اب ہم اس دور میں رہ رہے ہیں جہاں ہمیں ان سب کے فطری اسباب معلوم ہو چکے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے زمین کے گرد گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں اس کا کریڈٹ کسی خدا یا دیوتا کو دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کائنات کے دیگر فطری عوامل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بھی خدا کے بجائے اس کی توجیہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

موت واقع ہو جانے کے بعد انسان کا تعلق اس دنیا سے ختم ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی لوٹ کے نہیں آتا۔ مرنے سے پہلے ہم موت کے بعد کیا ہوتا، اور کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اس لیے عقیدۂ آخرت کو تسلیم کرنا غیر ضروری ہے۔ ان کے نزدیک چونکہ مذہبی عقائد کی کوئی ٹھوس قابل مشاہدہ دلیل نہیں ہوتی لہٰذا اسے اب ایک گزرے ہوئے زمانے کا قصہ سمجھ کر بھول جانا چاہیے اور مذہبی عقائد کو تسلیم کرنا انسانی عقل کی شان کے خلاف ہے کیونکہ جن سوالات اور مسائل کے لیے خدا اور مذہب کا وجود تھا اب ہمارے پاس ان کے خالص ٹیکنیکل اور منطقی جوابات موجود ہیں۔ ان ملحدین فلاسفہ کا اصرار ہے کہ ایک عقل پسند شخص ایسی کسی بات پر ایمان نہ لائے جس کا مشاہدہ حواس خمسہ سے نہ ہو۔

نفسِ انسانی کے متعلق ملحدین کا نقطۂ نظر

اہل مذہب نفس انسانی سے متعلق امور کو روح سے جوڑتے ہیں، چونکہ روح کا کوئی مادی وجود نہیں ہے لہٰذا ملحدین روح کو نہیں مانتے۔ ملحدین کی اکثریت نظریہ ارتقا (Evolution Theory) کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے نفسِ انسانی کے متعلق یہ مانتے ہیں کہ روئے زمین پر اربوں سال پہلے ساحل سمندر سے زندگی کی ابتداء ہوئی۔ پھر اس سے نباتات اور اس کی مختلف انواع وجود میں آئیں۔ پھر

نباتات ہی سے ترقی کرتے کرتے حیوانات پیدا ہوئے۔ انہی حیوانات میں سے ایک بندر تھا، جس سے نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا موجودہ انسان کا وجود ہوا۔ انسان کے نفس میں جو کچھ اس کی تمنائیں، جذبات، عقل وغیرہ سبھی صرف خلیوں (Cells) کے نظام اور خارجی دنیا کے ساتھ انسانی جسم کے تعلق کا نتیجہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دو پتھروں کو باہم رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔

طرزِ حیات

خدا کے وجود کے انکار کے ساتھ ہی لازمی نتیجہ کے طور پر وحی اور آسمانی صحائف کی بھی کوئی حقیقت واہمیت ملحدین کے نزدیک باقی نہیں رہتی۔ اہل مذہب کے مطابق خدا تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے لیے وحی نازل فرمائی تا کہ انسان ان احکامات کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ لیکن جب مذہب کا انکار کیا جارہا ہو تو پھر طرزِ حیات کے متعلق سوچ و فکر میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ملحدین طرزِ حیات کے متعلق عام طور پر سیکولرزم اور معاشیات میں اکثریت سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کی قائل ہے۔

سیکولرزم

علوم عمرانیت کے ماہرین کے نزدیک سیکولرازم کی کوئی مخصوص تعریف نہیں ہے۔ تاہم اپنے بنیادی افکار اور اجزا کے اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ سیکولرزم وہ بنیادی اصول ہیں جس کے تحت انسان کے معاشرتی، سیاسی و معاشی معاملات اور فیصلے مذہبی اثرات سے آزاد ہوتے ہیں۔ سیکولر حضرات کا ماننا ہے کہ سیاست، معیشت و معاشرت اور دین یہ سب الگ الگ ہیں لہٰذا انہیں علیحدہ ہی رہنا چاہیے۔ سیکولرزم کی تحریک دراصل اس دور میں اٹھی یورپ میں چرچ کا ریاست کے معاملات میں اثر و رسوخ حد سے بڑھ گیا تھا۔ مذہبی رہنماؤں کی جانب سے ہونے والے مظالم کے ردعمل میں اٹھی تھی، جس میں مذہب سے کلی طور پر بیزاری کا اظہار کیا گیا تھا۔ بعد ازاں مختلف دیگر تحریکوں کے اثرات کی بدولت سیکولرزم میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں، لیکن بنیادی طرزِ فکر یکساں ہی رہا ہے۔ موجودہ دور میں سیکولرزم کو بطور سیاسی نظام اپنایا جارہا ہے جس کی ایک واضح مثال بھارت ہے۔

اہل مذہب کے ہاں بھی ایسے افراد ملتے ہیں جو اپنے مذہب عقائد و نظریات سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتے اور طرزِ فکر کے اعتبار سے ملحدین کی طرح سیکولرزم پر یقین رکھتے ہیں۔

معاشی نظام

معاشی نظام کے متعلق ملحدین دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ سرمایہ دارانہ نظام کا قائل ہے جس کی بنیاد سود ہے۔ جب کہ

دوسرا گروہ اشتراکیت کا قائل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا اصرار ہے کہ ہر انسان کو تجارتی و صنعتی سرگرمیوں کے لیے قطعی آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ منافع کمانے کے لیے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کر لے، منافع کے حصول کے لیے مذہبی قوانین کے تحت حلال و حرام کی کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ نیز اس معاشی نظام میں سود، بیمہ، انٹرسٹ وغیرہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے برعکس اشتراکی نظام میں کوئی بھی کاروبار شخص کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہوتی ہے اور سبھی افراد حکومت کے ملازم ہوتے ہیں۔ اشتراکیت کی مختلف صورتیں موجودہ دور میں رائج ہیں۔

فری سیکس

الحاد کے فروغ کے ساتھ ہی مغرب میں جنسی آزادی کا تصور بیدار ہوا۔ اکثر ملحدین کے مطابق کھانے پینے سونے کی طرح جنسی خواہشات کی تکمیل انسان کی فطری خواہش ہے اور لہٰذا اسے اجازت ہونی چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کرے۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک زنا بالجبر ایک غلط کام ہے مگر دونوں فریقین کی رضامندی سے ہونے والے جنسی تعلق میں کوئی برائی نہیں۔

فری سیکس کے تصور کو سب سے اہل مغرب میں مشہور ملحد ماہر نفسیات اور نیورولوجسٹ سگمنڈ فرائڈ (1856-1939) نے پیش کیا تھا۔ فرائڈ کے مطابق جس طرح انسان بھوک، پیاس وغیرہ جیسی خواہشات کو پورا نہ کرے تو بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح جنسی خواہش کی تکمیل نہ ہونے پر بھی انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ فرائڈ کے نظریے کو اہل مغرب نے بخوشی قبول کیا اور مصنفین، فلسفی، موسیقار، شعراء، ڈرامہ نگار اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگوں نے اس تصور کے فروغ کے لیے اپنی اپنی کوششیں کیں۔ دور حاضر میں جب مغرب میں فلم انڈسٹری قائم ہوئی تو اس انڈسٹری نے بھی جنسی آزادی کے تصور کو بے حد عام کیا۔ ابتداء میں عمومی قسم کی فلموں کے ذریعے لوگوں کے جنسی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئیں لیکن جلد ہی باقاعدہ طور پر اس مقصد کی تکمیل کے لیے پورنوگرافی پر مبنی فلم انڈسٹری قائم کی گئی جس کا اہم مقصد اباحیت اور ننگے پن (Nudism) کا فروغ ہے۔ اس انڈسٹری میں کام کرنے والوں کو مغرب میں اس عصمت فروشی کی حیثیت سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ محض ایک فلمی پیشے کی حیثیت رکھتا ہے۔

خواتین میں فری سیکس تحریک کے فروغ میں ایک اہم رکاوٹ جنسی تعلق سے حاملہ ہونے کا خوف تھا لیکن مانع حمل ادویات کی ایجاد نے اس تصور سے متاثر خواتین کو اس میدان میں آگے بڑھنے کا موقع دیا کہ وہ شادی کے بغیر جنسی تعلق سے بھی حاملہ نہ ہوں۔ بعد ازاں مغرب میں آزادانہ جنسی تعلق کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جس کے مطابق زنا بالجبر کے علاوہ انسان جس طرح جس سے چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کر سکتا ہے، اگر وہ ہم جنس پرستی کرے تو اس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کا حق ہے۔ بیسویں صدی

میں انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی بدولت اہل مشرق بھی اس جنسی بے راہ روی سے شدید متاثر ہوئے جس کا نتیجہ آج ہم بخوبی دیکھ رہے ہیں۔

اسائن منٹس

1. آپ کے خیال میں خدا کے انکار کی اہم وجوہات کیا ہوتی ہیں؟
2. مذہب اور خدا کے انکار سے کیا اخلاقی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں؟
3. خدا کے وجود کے تین اہم دلائل لکھیے۔
4. سائنس خدا کے وجود کو ثابت کر رہی ہے یا رد؟ بحث کیجیے۔

باب 6: دیگر مذاہب

اس باب میں ہم دنیا کے دیگر اہم مذاہب کا مختصراً مطالعہ کریں گے۔

زرتشتیت

زرتشتیت یا زرتشزم ایک قدیم مذہب اور فلسفہ ہے جو کہ جو چھٹی صدی قبل مسیح کی شخصیت "زرتشت (Zoroaster)" سے منسوب ہے۔اس مذہب کے ماننے والوں کو "پارسی" کہا جاتا ہے۔زرتشتیت کا وجود ایران، آذربائیجان، بھارت، پاکستان اور اس کے ارد گرد کی ریاستوں میں ہے۔ نیز دنیا کے دیگر خطوں میں بھی یہاں سے ہجرت کر جانے والے پارسیوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔

تاریخ

اس مذہب کی تاریخ جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس مذہب کے ظہور سے پہلے ایران اور اس کے قرب و جوار کی مذہبی حالت کا جائزہ لے لیں تاکہ اس مذہب کی پیدائش کا پس منظر واضح ہو سکے۔

زرتشت (c. 600CE) سے قبل ایران میں کوئی خاص مذہب رائج نہ تھا ملکہ یہاں مظاہر پرستی اور مشرکانہ مذاہب کی مختلف صورتیں رائج تھیں۔ یہاں وسط ایشیاء سے ہجرت کر کے آنے والی قوم آریا آباد تھی اور ان کا مذہب مشرکانہ تھا۔ حیوان، سورج، چاند، آگ، پانی، ہوا، سیارے، آباءاجداد اور قبائلی دیوتاؤں کو پوجنے کا عام رواج تھا۔ یہ قریب ویسا ہی مذہب تھا جو اس دور میں ہندوستان میں رائج تھا۔

زرتشت کے زمانے کا درست اندازہ تو نہیں لگایا جا سکا تاہم ماہرین کا خیال ہے کہ زرتشت کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کا ہے۔ روایات کے مطابق وہ آذربائیجان میں پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن کے حالات مقدس کتابوں سے واضح نہیں ہوتے تاہم یہ معلوم ہے کہ انہوں نے مختلف علوم و فنون سیکھنے کے بعد گلہ بانی میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ان کا دل خدمت خلق کی طرف مائل تھا۔ وہ جوانی میں ہی اپنے آبائی مذہب سے غیر مطمئن تھے۔وہ انسان سے متعلق کئی اہم مسائل پر غور و فکر کیا کرتے تھے لیکن انہیں اپنے سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل سکا۔ بیس سال کی عمر میں وہ کسی پہاڑ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ایک مدت کے بعد انہیں معراجِ آسمانی نصیب ہوا اور انہیں وہ مقدس کلمات الہام ہوئے جو ان کی تعلیمات کا مجموعہ "گاتھا" کی بنیاد ہیں۔ گاتھا وہ مقدس نظمیں ہیں جو زرتشت سے منسوب کی جاتی ہیں۔

وحیٔ الٰہی سے منور ہونے کے بعد زرتشت نے پیغمبرانہ کوششوں کا آغاز کر دیا۔ زرتشت نے کائنات میں جاری خیر اور شر کی کشمکش کو اپنی دعوت کا خاص موضوع بنایا۔ انہوں نے متضاد جوڑوں جیسے خیر اور شر، روشنی اور تاریکی، نیکی اور بدی کی صورت میں اپنا فلسفہ بیان کیا۔ دس سال تک کی تبلیغ کے بعد بھی انہیں خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس کے بعد زرتشت بلخ کے بادشاہ گستاشپ (Vishtaspa c. 600-500BC) کے پاس اپنا پیغام لے کر گئے۔ بادشاہ کے درباری علماء نے زرتشت سے مناظرہ کیا جس میں زرتشت نے اپنے مذہب کے دلائل کے ساتھ اس وقت کے مروجہ مذہب کو بھی باطل ثابت کر دیا۔ بادشاہ نے ان کا مذہب قبول کر لیا اور اس کے بعد یہ مذہب تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ ایک بڑی تعداد میں ان کے مخالفین کے باوجود ان کا مذہب ایران کے ایک بڑے حصے تک پھیل گیا۔ اسی اثناء میں اس وقت کی ایک سلطنت توران اور ایران کے مابین جنگ شروع ہو گئی اور ایک تورانی نے موقع پا کر زرتشت کو شہید کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 77 سال تھی۔

زرتشت کی وفات کے بعد ان کے مذہب کی جو صورت حال رہی اس کے بارے میں تاریخی تسلسل کئی جگہوں سے منقطع ہے۔ زرتشت مذہب مشرقی ایران سے ہوتے ہوئے مغربی کچھ ہی عرصے میں ایران کے مغربی حصے میں پہنچا۔ ایران کا یہ علاقہ سیاسی و تہذیبی اعتبار سے متاثر کن حیثیت رکھتا تھا، یہاں کے مذہبی طبقے "مغ" نے اس مذہب کو قبول کر لیا، مغوں کی حیثیت وہی ہے جو ہندوستان میں برہمن کی ہے۔ مغوں کے قبول زرتشتیت سے زرتشت مذہب کی سرکردگی اس طبقے کے ہاتھ آئی تو انہوں نے اسے اپنی قدیم روایات اور عقائد کے ساتھ پیش کیا۔ مورخین نے مغوں کی جو مذہبی خصوصیات لکھی ہیں وہ سبھی زرتشت مذہب کا حصہ بنتی گئیں۔

ایران کی بڑی سلطنت ہخامنشی (550–330 BCE) کے حکمران بھی اسی مذہب کے پیروکار تھے۔ زرتشت کی تعلیمات پر مبنی کتابوں میں ہمیں توحید کا تصور اور کثرت پرستی کی تردید انتہائی واضح الفاظوں میں ملتی ہے، لیکن ہخامنشی کے دور کے جو کتبات دریافت ہوئے ہیں ان میں آگ کی تعظیم اور دیوتاؤں کی حمد و ثناء کا ذکر عام ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا وہ واضح تصور جو زرتشت نے قائم کیا تھا، ایران کے قدیم مذہب کے اثرات کے آگے زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکا، اور ہخامنشی سلطنت کے آخری دور میں اس مذہب میں بہت سے عوامی رجحانات اور ایران سے قدیم مذہب کے اثرات داخل ہو چکے تھے۔ چنانچہ زرتشت کی مقدس کتاب "اوستا" کا وہ حصہ جو اس دور کے مذہب کی ترجمانی کرتا ہے، قدیم منظومات کے برعکس کئی دیوتاؤں کے ذکر سے پُر ہے۔ قربانی، سوم رس (مقدس مشروب) اور دیگر رسومات میں بھی زرتشتیت اور قدیم مذہب میں زیادہ فرق نہیں رہا تھا۔ 330BC میں ہخامنشی سلطنت کا خاتمہ سکندر اعظم (356-323BC) کے ہاتھوں ہوا اور ایران میں یونانی حکمرانوں کا تسلط قائم ہوا۔ سکندر اعظم نے اس دور میں عظیم لائبریری "پرسپولس" کو بھی تباہ کر دیا تھا جہاں زرتشت مذہب کی مقدس کتابیں کتبات میں لکھ کر محفوظ کی گئیں تھیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک ایرانی تہذیب یونان کی مرہون منت رہی اور ایرانی تہذیب یونانی تہذیب سے بہت متاثر ہوئی۔ اس دور کے بعد زرتشت مذہب کی

تاریخ کا بڑا حصہ نامعلوم ہے۔ سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ اس دور میں زرتشت مذہب میں ہمیں کئی ایسے یونانی دیوتاؤں کا وجود ملتا ہے جو اس سے پہلے زرتشت مذہب میں نہیں تھے۔247BCمیں اشکان اول (r.250 - 211BC)نے یونانی سلطنت کا خاتمہ کر کے "پارتھیا" سلطنت قائم کی۔ پارتھیا سلطنت کے حکمرانوں کا مذہب بھی زرتشتیت تھا۔ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنے مذہب کی ترویج یا تنظیم نو کے لیے اقدامات کیے ہوں گے، تاہم یہ یقینی ہے اس سلطنت کے آخری زمانے کے بادشاہ ولاش یکم (Vologases I of Parthia 51-78CE) نے اوستا کو مرتب کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس اوستا کی تاریخ میں کوئی معلومات نہیں ہے۔ یہ سلطنت224CEمیں زوال کا شکار ہوئی اور ساسانی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ ساسانی حکومت نے اپنے دور میں زرتشت مذہب کے استحکام اور ترقی کے لیے کئی اہم اقدامات کیے، زرتشتیت کی مقدس کتابیں جو مختلف حصوں میں روایتاً موجود تھیں، اسے اکٹھا کیا گیا اور مقدس کتاب "اوستا" مرتب کی گئی۔ مذہبی و معاشرتی امور میں عوام کی رہنمائی کے لیے مذہبی رہنماؤں کا بھی ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا جس کے مطابق عوام کے سب سے قریب مذہبی طبقہ مغ تھا جن کا کام فتوے صادر کرنا، مذہبی رسوم کی ادائیگی، صلاح و مشورے دینا اور لوگوں کے باہمی جھگڑوں کو سلجھانا تھا۔ عبادت کے لیے آتش کدے قائم کیے گئے تھے جس کے سربراہ کو "مغانِ مغ" کے معزز لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ہر ضلع کے لیے ایک رہنماء مقرر تھا جسے "موبد" کا لقب دیا جاتا تھا۔ جبکہ تمام موبد کے سربراہ کو "موبدانِ موبد" کہا جاتا تھا جسے مذہب و شریعت کی تشریح میں اتھارٹی حاصل ہوتی تھی۔ نماز کی ادا کرانے کے لیے ایک مخصوص عہدہ ہوتا تھا جس کو "ہیربذ (خادم النار)" کہا جاتا تھا۔ فقہی مسائل میں لوگوں کی رہنمائی جن مذہبی ماہرین کے ذمے تھی انہیں "دستور" کہا جاتا تھا۔ ساسانی خاندان کے یہ دور زرتشت مذہب کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔اسی دور میں زرتشت مذہب ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔اس دور میں ایران کی ایک عظیم تہذیب کھڑی ہوئی جو اپنے دور کی دیگر رومی، ہندوستانی اور چینی تہذیب سے کم نہ تھی۔

زرتشتیت کی تنظیم نو کا یہ عمل مختلف ادوار میں ہوتے ہوئے شاپور اول(r.240-242 CE) کے دور تک چلتا رہا۔اس زمانے میں ثنویت پسند مکتب فکر غالب آچکا تھااور وہ مقدس کتابیں جو اس دور میں علماء کے حافظوں کی مدد سے پہلوی زبان میں مرتب کی گئیں اس میں ثنویت پسندی کا رجحان غالب رہا۔ ثنویت سے مراد خیر و شر کے دو خدا اہورامزد (خیر) اور اہرمن (شر) کا وجود ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کی ایک بڑی طاقت اسلام کا ظہور ہوا۔اس دور میں ایران میں خسرو پرویز(r. 590-628/6H) کا اقتدار ختم ہوا تھا۔اس کے بعد ایران کو کئی مسلم فاتحین کا سامنا کرنا پڑا جس میں انہیں ناکامی ہوئی اور ایران مسلمانوں کی زیر نگیں آ گیا۔ مسلمانوں نے یہاں زرتشت مذہب کے پیروکاروں کو مذہبی آزادی دی اور یہ لوگ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں اپنے عقائد پر قائم رہ سکتے تھے۔ لیکن ایران میں اسلام کے بعد زرتشت مذہب کا چراغ بالکل بجھ گیا اور ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ اور سوائے ایک قلیل

گروہ کے ایران میں زر تشت مذہب ختم ہو گیا۔900CE کے لگ بھگ ایران اور اس کے گرد و نواح میں باقی رہ جانے والے زر تشت پیروکار ہندوستان ہجرت کر گئے جہاں انہیں مخصوص شرائط کے ساتھ گجرات میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔ یہاں یہ لوگ پارسی (فارسی) کہلائے۔ ہندوستان میں پارسیوں نے کئی مقدس کتابوں کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا اور اپنے مذہب پر خاصا کام بھی کیا جس کے نتیجے میں ان کے ہاں ایک "علم الفقہ" کا ایک بڑا دفتر تیار ہو گیا۔ سترہویں صدی عیسوی میں جب یورپی اقوام نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو یہاں پارسیوں نے ان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر لیے اور جلد ہی پارسی معاشی اعتبار سے انتہائی مستحکم ہو گئے۔ اس وقت پارسیوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔

کتب مقدسہ اور دیگر اہم کتب

زر تشت مذہب کی مقدس اور مستند کتاب اوستا ہے جسے الہامی مانا جاتا ہے۔ زر تشت مذہب کی بنیاد اسی کتاب پر ہے اور مذہبی رسوم میں بھی اسی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ لیکن اوستا کے علاوہ بھی کئی ایسی کتابیں جو اس مذہب کا اہم ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔

1۔ ژند اوستا(Zend Avesta): اوستا جناب زر تشت کے اقوال اور اس دور کے حالات پر مبنی ہے۔ بائبل کی طرح یہ کتاب بھی کئی ادوار پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے بنیادی طور پر پانچ حصے ہیں: پہلا حصہ دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ دوسرے حصے میں خدائے خیر آہورا مزدا اور اس کے مزعومہ شریکوں کا ذکر ہے۔ تیسرے حصے میں بھوت پریت اور خبیث روحوں کے مقابلے کی تدابیر ہیں۔ چوتھے حصے میں مختلف بھجن اور مناجات ہیں اور پانچویں حصے میں وہ دعائیں ہیں جو عبادات میں پڑھی جاتی ہیں۔ زر تشت مذہب کی ایک اہم کتاب "دین کرد" کے مطابق اوستا میں اور بھی کئی حصے تھے لیکن وہ حصے اب دستیاب نہیں ہیں۔ موجودہ اوستا کہاں سے نقل کی گئی ہے اس بارے میں بھی کوئی حتمی رائے نہیں ہے۔

2۔ دساتیر: اوستا کے بعد پارسیوں کے ہاں دوسری مقدس کتاب "دساتیر" مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب پندرہ صحائف پر مشتمل ہے جو پندرہ مختلف وخشور (پیغمبروں) سے منسوب ہے۔ روایات کے مطابق ان پیغمبروں کا قدیم دور سے تھا۔ اس کتاب میں توحید اور مظاہر پرستی دونوں کی تعلیمات ملتی ہیں۔

3۔ شاہنامہ: شاہنامہ کے معنی "شاہ کے بارے میں" ہے۔ یہ کتاب اگرچہ فارسی زبان کے ادبی سرمائے سے تعلق رکھتی ہے لیکن زر تشت مذہب میں بھی اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس کی وجہ اس کتاب میں مذکور اُن شخصیات کا تذکرہ ہے جنھیں زر تشت مذہب کے پیروکار بھی خدا کے نیک بندے مانتے ہیں۔ یہ کتاب ایک شاعرانہ تصنیف ہے جو فارسی کے ممتاز شاعر فردوسی (940–1020CE) نے لکھی۔ اس شعری مجموعے میں قدیم ایران (فارس) سے لے کر اسلامی سلطنت کے قیام تک کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مجموعہ تقریباً60,000 سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔

4۔ دین کرد: دین کرد(Dēnkard) موجودہ زرتشتیت کی ایک اہم کتاب ہے جو اوستا کا خلاصہ مانی جاتی ہے۔ اس میں مذہبِ زرتشت کے عقائد و رسوم بیان کیے گئے ہیں۔ موجودہ زرتشتیت کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں اوستا کی کئی ایسی کتابوں کا ذکر ہے جو آج دستیاب نہیں ہے۔ یہ کتاب نویں صدی عیسوی میں کئی مصنفین نے مرتب کی۔ دین کرد میں کُل 9 کتابوں (نسک) پر مشتمل تھی لیکن اس کی ابتدائی کتابیں اول، دوم اور سوم کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا اصلی نسخہ اب دستیاب نہیں ہے۔

عقائد[1]

1۔ توحید یا ثنویت(Dualism)

جناب زرتشت سے منسوب اوستا کے قدیم حصے گاتھا اور دساتیر میں موجود موحدانہ تعلیمات کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت پکے موحد تھے اور انہوں نے توحید کی ہی تعلیم دی لیکن ان کے بعد ان کے پیروکاروں میں مشرکانہ مذہب فروغ پا گیا۔ موجودہ زرتشت مذہب کی بنیاد ثنویت(Dualism) ہے۔

اس تصور کے مطابق دنیا کا خالق ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ایک وہ جس نے تمام مفید اور نفع بخش اشیاء پیدا کیں، خیر کے خالق اس خدا کو "اہورامزدا" کہتے ہیں۔ اس کے مقابل دوسرا خالق وہ ہے جس تمام مضر اور تکلیف دہ امور تخلیق دیے اور خدائے شر قرار پایا۔ اس خدا کو "اہرمن(Angra Mainyu)" کہا جاتا ہے۔ عصر حاضر میں پارسیوں کے ہاں بھی موحدانہ رجحان فروغ پا رہا ہے اور ثنویت کی ایسی تشریحات پیش کی جارہی ہیں جو توحید کے خلاف نہ ہو۔ تاہم اس میں بنیادی طور پر خیر و شر کے علیحدہ خالق کا تصور وہی ہے۔

2۔ امیشا سپنٹا

گاتھاؤں میں ہمیں چھ متبرک نورانی ہستیوں یا صفات کا ذکر ملتا ہے جنھیں امیشا سپنٹا یعنی غیر فانی کہا جاتا ہے۔

1. وُہو مناہ (Vohu Manah) نیک خیال
2. آشاوہشتا (Asha Vahishta) صداقت

---

[1] پارسی عقائد کی تفصیل اس کتاب سے ماخوذ ہے:

S. Nigosian. Zoroastrian Faith: Tradition and Modern Research. Canada: McGill-Queen's Press . 1993

3. خشتراویریہ (Khshathra Vairya) مکمل اختیار

4. سپنٹاامریتی (Spenta Armaiti) عقیدت اور اخلاص

5. ہوروَتات (Haurvatat) بے عیبی

6. امریتات (Ameretat) بقائے دوام

ان میں سے اوّل الذکر تین ہستیاں مونث (مادہ) خیال کی جاتیں ہیں۔[1] مقدس کتابوں اور پارسیوں کے عقیدے کے مطابق یہ چھ ہستیاں خدائے خیر اہورامزدا کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ان سپنٹوں کو فرشتوں کا سردار اور بعض کے نزدیک اسے اہورامزدا کی صفات سمجھا جاتا ہے۔ گاتھاؤں کی ان سپنٹوں کے حصول کی دعائیں بھی ملتی ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدس کتاب کے مطابق یہ دراصل خدا کی صفات ہیں۔ تاہم زرتشت مذہب میں ان چھ صفتوں کے باقاعدہ جسم مانے گئے ہیں۔

3۔ یزداں (Yazata)

پارسیوں کے ہاں ہمیں بعض ایسی مقدس روحانی ہستیوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو قریب اسلام اور یہودیت میں ملائکہ جیسی ہستیوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ زرتشت مذہب میں یہ ہستیاں یزداں کہلاتی ہیں۔ زرتشتی عقائد کے مطابق یہ ہستیاں کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے اہورامزدا نے تخلیق کی ہیں۔ ان میں اکثر نام وہیں ملتے ہیں جو زرتشت مذہب سے قبل بابل اور ایران کے قدیم مشرکانہ مذاہب میں دیوتاؤں کے نام تھے۔ ان یزداں میں کئی نسوانی صفات کے بھی حامل ہیں۔

4۔ حیات بعد الموت

پارسیوں کے ہاں حیات بعد الموت کے عقیدے کے متعلق اوستا میں تفصیل ملتی ہے جہاں زرتشت اور خدا تعالیٰ کے مابین ہونے والا مکالمہ درج ہے۔ اس کے مطابق نیک آدمی کی روح مرنے کے بعد تین دن تک گاتھا پڑھتی رہتی ہے اور اس کے بعد نورانی ہیت اختیار کر جاتی ہے۔ اسے خوشبودار ہوا ملتی ہے جس سے ایک خوبصورت دوشیزہ پیدا ہوتی ہے۔ اس دوشیزہ کی رہنمائی میں وہ ایک پل پار کر کے جنت تک پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ بدکردار انسان کی روح کو انتہائی تکلیف ملتی ہے اور اسے بدبودار ہوا ملتی ہے۔ اس ہوا سے ایک بدصورت بڑھیا پیدا ہوتی ہے جس کی رہنمائی وہ ایک پل پار کرتے ہوئے اوندھے منہ جہنم میں گر جاتا ہے۔ یاسنا کے مطابق ہر شخص کو مرنے کے بعد ایک پُل "چینود" سے گزرنا ہو گا جو کہ تلوار سے زیادہ پتلا ہو گا۔ اس پل سے گزر کر نیک اور بد اپنے اپنے ٹھکانے یعنی بہشت اور جہنم میں جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اوستا میں یہ تصور بھی ملتا ہے کہ دو فرشتے انسان کے اعمال کا اندراج کرتے ہیں جو ایک عظیم عدالت

[1] S. Nigosian, Zoroastrian Faith: Tradition and Modern Research, Canada: McGill-Queen's Press - MQUP, 1993

میں تولے جائیں گے۔

5۔شاہ

شاہنامہ میں ہمیں مختلف مقدس ہستیوں کا ذکر ملتا ہے جنھیں شاہ کالقب دیا گیا ہے۔عام معنوں میں شاہ سے مراد "بادشاہ" ہے لیکن اس کتاب میں ان شخصیات کے متعلق جو باتیں منسوب ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام انسان نہ تھے۔شاہنامہ اور زرتشتیت کے عام عقیدے کے مطابق گیومرث (Keyumars) زمین پر پہلے انسان تھے۔گیومرث کا ذکر زرتشت کی مقدس کتابوں میں ہمیں اس کا ذکر ملتا ہے۔گیومرث کے علاوہ بھی کئی دیگر شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔یہ عقیدہ ابراہیمی مذاہب میں رائج پیغمبری کے عقیدے کے مماثل ہے۔

عبادت ورسوم

پارسیوں کے ہاں عبادت کا طریقہ بالکل سادہ ہے۔صندل کی لکڑی سے آگ جلائی جاتی ہے اور اس آگ کے سامنے مقدس کلمات پڑھے جاتے ہیں۔پارسیوں کے مطابق یہ عبادت آتش پرستی نہیں ہے بلکہ وہ آگ کو یزدانی قوت کی علامت بتاتے ہیں۔ آگ کے سامنے عبادت کا یہ طریقہ ایران کے قدیم مذہب سے چلا آرہا ہے۔عام طور پر یہ عبادت اکیلے ہی کی جاتی ہے البتہ خاص تہواروں کے موقع پر اجتماعی عبادت کی جاتی ہے۔مقدس کتاب بالخصوص گاتھاؤں کی تلاوت بھی ثواب کا موجب سمجھی جاتی ہے۔

ایک خاص عبادت یاسنا کہلاتی ہے۔یہ اسی قسم کی عبادت ہے جو ہندوؤں کے یجنا کہلاتی ہے۔پارسیوں کے ہاں یاسنا چھ سپنٹوں کے لیے ادا کی جاتی ہے۔یہ سال کے مخصوص ایام (تہواروں) میں ادا کی جاتی ہے جنھیں جشن کہا جاتا ہے۔

زرتشت مذہب میں مرنے کے بعد میت سلے ہوا کفن پہنایا جاتا ہے اور نہلانے کے بعد مردے کو لوہے کے تابوت میں رکھا جاتا ہے۔ یہ تابوت "گھن" یا "گاھان" کہلاتا ہے۔انگریزی میں اسے Tower of silence کہا جاتا ہے۔اس کے بعد اس تابوت کو مرحوم کے عزیز واقارب کے ہمراہ جنازے کی صورت میں "دخمو" لے جاتے ہیں جو کہ پارسیوں کا قبرستان ہوتا ہے۔یہ کسی اونچائی (مثلاً پہاڑ) پر ایک قسم کا میدان ہوتا ہے جس کی چار دیوارایں ہوتی ہیں۔یہاں مرد اور عورت میت کے لیے علیحدہ کنویں ہوتے ہیں جہاں مردے کو رکھ کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔اس کے بعد مرنے والے کی یاد میں تیسرے، چوتھے، تیسویں اور ایک سال بعد تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے
-

تہوار

پارسیوں میں یہ تہوار عام طور پر منائے جاتے ہیں:

1۔ زرتشت نو دِسو: یہ تہوار زرتشت کی برسی کا دن ہے جو عیسوی کیلنڈر کے مطابق 26 دسمبر کو آتا ہے۔اس دن پارسی حضرات خاص طور پر عبادات کا اہتمام کرتے ہیں، زرتشت کی سیرت بیان کرنے کے لیے محفلیں سجاتے ہیں۔ اس دن عبادت گاہ میں خاص طور پر حاضری دی جاتی ہے۔

2۔ خورداد سال: یہ تہوار زرتشت کے یوم پیدائش کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ پارسیوں کے لیے انتہائی پر مسرت دن ہوتا ہے اور اس دن عبادات کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

3۔ نوروز: نوروز ایرانی کیلنڈر کے نئے سال اور موسم بہار کا پہلا روز ہوتا ہے جس کے خیر مقدم کے لیے ایران بھر میں پر مسرت تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یہ دن عام طور پر 21 مارچ کے آس پاس منایا جاتا ہے۔ نوروز کا تہوار زرتشت مذہب کے ماننے والے بھی بڑی عقیدت سے مناتے ہیں۔ اسے ایران کے قومی تہوار کی حیثیت حاصل ہے۔

4۔ شب یلدا: یہ تہوار سردیوں کے موسم میں منایا جاتا ہے۔ یہ تہوار 21اور 22دسمبر کی درمیانی رات کو منایا جاتا ہے جو سال کی طویل ترین رات شمار ہوتی ہے۔ رات بھر جشن کا سماں ہوتا ہے اور مختلف تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ تربوز اور انار کو کھانوں میں خاص طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ خاندان کے سارے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر اس رات کو گزارتے ہیں۔ چونکہ اس رات کو نجس اور نحوست والی رات تصور کیا جاتا ہے اس لیے لوگ چراغاں کر کے یا آگ جلا کر اس رات کو گزارتے ہیں تاکہ وہ اس رات کی نحوست اور شیطانی نقصانات سے محفوظ رہ سکیں۔

5۔ پیتی: یہ ایرانی کیلنڈر کے آخری پانچ روز منایا جاتا ہے۔ ان دنوں گھروں کو سجایا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو تحائف دیے جاتے ہیں۔ اس دن خاص طور پر سوجی، دال اور پلاؤ اور مچھلی پکائی جاتی ہے۔

پارسی فرقے اور تحریکیں

زمانہ قدیم میں دیگر مذاہب کی طرح دینِ زرتشت میں بھی کئی فرقے تھے لیکن اس مذہب کے زوال کے بعد یہ فرقے بھی معدوم ہو گئے۔ اس وقت جو فرقے ہیں ان کے باہم کوئی اہم اختلاف نہیں ہے، ان کی عبادت گاہیں، عبادت کا طریقہ اور رسوم و رواج یکساں ہیں۔ صرف چند ایک معمولی معاملات میں اختلاف ہے۔ پارسیوں کے اکثر فرقے بھارت سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز ان کے ہاں جدت پسند اور قدامت پسند طبقہ بھی موجود ہے جو اپنی اپنی فکر کے مطابق زرتشت مذہب کی تشریح کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی علاقائی اعتبار سے پارسیوں کے گروہ موجود ہیں لیکن ہم انہیں فرقہ نہیں کہہ سکتے۔ چند اہم گروہ یہ ہیں:

1۔ مہر بابا: مہر بابا(1969– 1894) ایک مشہور صوفی پارسی تھے۔ ان کے ماننے والے انہیں وقت کے دیوتا کا اوتار مانتے ہیں۔ یہ تصور غالباً ہندوؤں سے ان کے ہاں آیا ہے۔

2۔ علم خوشنوم: یہ پارسیوں کا ایک مختصر فرقہ ہے جو تصوف کا قائل ہے۔ یہ ایک علیحدہ فرقہ نہیں بلکہ پارسیوں کے سبھی فرقوں میں موجود ہیں۔ علم خوشنوم گاتھاؤں میں روحانی علم کو کہا گیا ہے۔ پارسیوں میں اس تحریک کے بانی بہرم شاہ شروف (1857-1927) ہیں۔ پارسیوں میں اہل تصوف کے ہاں کوئی خاص الگ سے رسوم یا عبادت گاہیں نہیں تاہم شاہ شروف جی نے اپنی تعلیمات کے فروغ کے لیے ممبئی (بمبئی) میں ایک عبادت گاہ بنائی تھی۔

3۔ شہنشاہی، قدیمی، فصلیں: ایرانی کیلنڈر کے متعلق بعض اختلاف کی بنا پر پارسیوں کے ہاں تین گروہ ہیں جنھیں شہنشاہی، قدیمی اور فصلس کہا جاتا ہے۔

4۔ جدت پسند گروہ (Restorationists): یہ ایک پارسی تحریک ہے جس سے وابستہ لوگ صرف گاتھاؤں پر ایمان رکھتے ہیں۔ موجودہ پارسیوں میں ان کی تعداد تقریباً 15 فیصد ہے۔

سکھ مت

سکھ مت کے متعلق ہم ہندومت کے باب میں پڑھ آئے ہیں کہ چودھویں صدی عیسویں کے آخر میں اٹھی تھی جس کے بانی گرونانک تھے۔ موجودہ دور میں سکھ مت برصغیر کا ایک اہم مذہب سمجھا جاتا ہے یہ مذہب بنیادی طور پر ایک پنجابی مذہب ہے جس توحیدی مذاہب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مذہب کے پیروکاروں کو سکھ کہا جاتا ہے۔۔ ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے جو خود کو بابا گرونانک (1469 –1539CE) کے مذہب سے منسوب کرتی ہے۔

تاریخ

گرونانک 15 اپریل 1469 کو لاہور سے قریب ایک تلونڈی (جو اب ننکانہ صاحب کہلاتا ہے) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کھتری خاندان سے تھا۔ سنسکرت اور مذہب سے متعلق ابتدائی تعلیم ایک برہمن سے حاصل کی اور اس کے بعد عربی و فارسی کے لیے ایک مسلمان استاد کے ہاں زیر تعلیم رہے۔ بچپن ہی سے ان کا دل خدمت خلق اور صوفیانہ رجحانات کی طرف مائل تھا۔ اس لیے وہ اپنا زیادہ تر وقت غور و فکر میں گزارتے تھے۔ ان کی سوانح "جنم ساکھی" میں ہمیں کئی ایسی روایات ملتی ہیں کہ انھوں نے بچپن ہی سے کئی ہندو رسوم و عبادات کی مخالفت کا اظہار کیا تھا۔ گنگا میں نہانا، ذات پات، بت پرستی اور قربانی جیسی رسموں کی انھوں نے کئی موقعوں پر

مخالفت کی۔ ان کے صوفیانہ رجحانات کی وجہ سے ان کے والد نے انھیں ان کی بہن کے پاس سلطان پور بھیج دیا۔ یہاں گرونانک کی شادی ہوئی اور دو بیٹے ہوئے۔ سلطان پور میں قیام، ملازمت، شادی اور بچوں کے بعد بھی ان کے صوفیانہ رجحان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں انھوں نے خدائے واحد کی حمد و ثناء کرنے کا مشغلہ اختیار کیا اور اپنے روحانی ذوق کی تسکین کی۔ ان کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے ندی کے کنارے چلے جاتے اور وہیں ندی میں غسل کرنے کے بعد دن بھر اشعار پڑھتے رہتے۔ شاعری پڑھتے ہوئے ان کے ساتھ ان کے خاص دوست بھی ہوتے جو رباب بجا کر ان کا ساتھ دیتے تھے۔ اسی شہر میں انھیں سکھ روایات کے مطابق خدا کا عرفان حاصل ہوا۔ اس عرفان کے بعد انھوں نے اپنا تبلیغی سفر شروع کیا اور دنیا کے مختلف خطوں میں جا کر کئی مذاہب کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ انھوں نے یہ سفر کئی ہندو سنیاسیوں (درویشوں) اور مسلم صوفیاء کے ساتھ کیا، ان سے ملاقاتیں کیں اور باہم تبادلۂ خیال کیا۔ روایت ہے کہ انھوں نے مکہ و مدینہ کی زیارت بھی کی۔ گرونانک کا انتقال ستمبر 1539 میں ہوا۔

گرونانک چونکہ درویش اور صوفیانہ خیالات کے حامل تھے، اسی لیے انھوں نے مسلم اور ہندو صوفیاء مثلاً بابا فرید، شیخ علی ہجویری، رامانند اور کبیر جیسے صوفی مفکرین کا عمیق مطالعہ کر رکھا تھا۔ ان کی تعلیمات میں اہم ترین بات ہندو مسلم اخوت و مساوات تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی شخص نہ تو ہندو ہے نہ ہی مسلمان ہے بلکہ سب خدا کے بندے ہیں۔ وہ ذات پات، بت پرستی، اوہام پسندی اور کثرت پرستی کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی تمام تر تعلیمات میں توحید اور مساوات کا درس دیا۔ مقدس کتابوں میں جو کلام ان سے منسوب ہے ان سب میں توحید، عشق الٰہی، مساوات اور عدم تشدد کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ ہندو مذہب اور اسلام میں اخوت کی ہی بناء پر ان کے انتقال کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ وہ انھیں دفن کریں گے کیوں کہ وہ مسلمان تھے جبکہ یہی دعویٰ ہندوؤں کا بھی تھا کہ وہ ہندو تھے چنانچہ انھیں آگ میں جلایا جائے گا۔ لیکن مانا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد ان کا جسم غائب ہو گیا تھا۔ ان کی تعلیمات کی ہی وجہ سے آج بہت سے مسلمان انھیں مسلمان مانتے ہیں۔

گرونانک کے بعد سکھوں میں گروؤں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان دس روحانی گروؤں کو سکھ اپنا مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔ یہ دس گرو بابا گرونانک کے انتقال کے بعد ڈھائی سو سال تک سکھ مت کے رہنماء اصول و قوانین وضع کرتے رہے۔ یہ سلسلہ دس گروؤں تک چلتا رہا۔ اس کے بعد سکھ مت کی مقدس کتاب "گرنتھ" کو گورو یعنی رہنماء کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ کتاب اب شری آدی گرنتھ یا گیان گرو گرنتھ کہلاتی ہے۔

نانک کے بعد چار گروؤں کی سوانح ہمیں جنم ساکھی نامی کتاب میں ملتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سبھی گروؤں کے مسلمان صوفیاء سے انتہائی گہرے اور اچھے تعلقات رہے نیز ان کا طرزِ حیات وہی درویشوں والا اور اسلامی طرزِ حیات سے قریب تھا۔ اگرچہ بادشاہوں

سے ان کے تعلقات رہے لیکن یہ گرو غیر سیاسی تھے۔ لیکن پانچویں گرو ارجن(1606–1563) کے بعد سکھ مت کی باقاعدہ تنظیم نو ہوئی اور سکھوں پر سیاسی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ گرو ارجن نے سکھوں کے لیے ایک مقدس کتاب مرتب کی اور امر تسر میں ایک عظیم عبادت گاہ "ہری مندر" تعمیر کروایا۔ ساتھ ہی انھوں نے سکھوں سے عشر (سالانہ پیداوار کا دسواں حصہ) وصول کرنے کی بھی ابتداء کی اور اس کی وصول یابی کے لیے ہر علاقے میں اپنے عہدیدار مقرر کیے۔ عشر کی وصولی سے سکھوں کی تنظیم اور ان کی ترقی کے لیے معاشی مدد بھی حاصل ہوگئی۔ سکھ مذہب کی تبلیغ اگرچہ باہر بھی کی گئی لیکن اس کے لیے پنجاب کا خاص محور بنایا گیا جس کی وجہ سے "جاٹ" قوم کی ایک بڑی تعداد نے یہ مذہب قبول کر لیا۔ اس قوم نے مستقبل میں سکھ مت کے بقاء کے لیے کئی جنگوں میں اہم کردار ادا کیا۔ چھٹے گرو ہر گوبند(1644 -1595) نے اپنے بزرگوں کی روایت کے برعکس فقیرانہ طرزِ حیات چھوڑ کر شاہانہ طرز اختیار کیا اور دو تلواریں لٹکانا شروع کر دیں۔ انھوں نے سکھوں کو نہ صرف مصلح رہنے کا حکم دیا بلکہ انھیں تمام تر عسکری مشاغل اختیار کرنے کی بھی تلقین کی جس کی وجہ سے سکھوں میں فنِ سپاہ گری کو فروغ حاصل ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے مختلف حریف کا ساتھ دینے کی وجہ سے گرو ہر گوبند کی مغل بادشاہ سے جنگ بھی ہوئی اور وہ بارہ سال تک قید رہے۔ رہائی کے بعد ان کا انتقال 1644 میں ہوا۔

گرو ہر گوبند کے علاوہ دسویں گرو گوبند سنگھ بھی سکھ مت کی تاریخ میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ گرو گوبند ہی تھے جنھوں نے سکھوں کو سیاسی طور پر منظم کیا اور ان کا ایک الگ مذہبی تشخص قائم کیا۔ کی جانب سے سکھ مت کی شریعت اور عقائد کے باب میں اہم اضافہ کیا گیا۔ بلکہ یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ جس سکھ مت کو آج ہم دیکھ رہے ہیں اس کی بنیاد انھی نے رکھی۔ ان کا انتقال 1765 میں ہوا۔

گرو نانک اور شروع کے گروؤں نے سکھ مت کی ایک الگ مذہبی پہچان نہیں رکھی تھی نہ ہی اسے مذہبی عقائد مجموعہ عطا کر کے دیگر مذاہب سے ممتاز کیا گیا تھا، یہی وجہ ہے ابتدائی دور میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی خود کو سکھ مت سے وابستہ رکھتے تھے لیکن آہستہ آہستہ سکھ مت ہندو مت سے قریب اور اسلام سے دور ہوتا گیا۔ مختلف گروؤں کی جانب سے ہونے والے اقدامات کے نتیجے میں سکھ مت ایک منظم مذہبی گروہ کی صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔ شادی بیاہ اور موت کے رسم ورواج متعین کیے جانے کے بعد اس کی ایک الگ حیثیت ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ دسویں گرو نے ایک ایک مخصوص آزمائش کے بعد ایک جماعت تشکیل دی جسے "خالصہ" کا نام دیا گیا۔ خالصہ کی تشکیل سے انھوں نے سکھوں کو ایک روحانی اتحاد بخشا اور اپنے متبعین کے لیے ایک مخصوص وضع قطع اور تہوار مقرر کرتے ہوئے انھیں ایک الگ حیثیت دی۔ سکھوں کے نام کے ساتھ لفظ "سنگھ" یعنی شیر کا استعمال بھی انھی کے حکم سے ہوا۔

کتب مقدسہ

سکھ مت کی مقدس کتاب گورو گرنتھ صاحب ہے ۔ مختلف گروؤں اور مشہور مسلمان صوفی بابا فرید کے (پنجابی) منظوم کلام پر مشتمل

ہے۔ اس کتاب کو پانچویں گرو اور اس کے بعد دسویں گرو نے مرتب کیا۔

عقائد و احکامات

موجودہ سکھ مت کے بنیادی عقائد میں توحید، تناسخ اور کرم کا عقیدہ شامل ہے۔ خدا کے لیے سکھوں کی مقدس کتاب میں وہ سبھی الفاظ ملتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں رائج ہیں، البتہ ان میں سے سکھ عام طور پر خدا کو پکارنے کے "واہے گُرو" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان تینوں عقائد کی تفصیل ہم گذشتہ صفحات میں دوسرے مذاہب کے تحت پڑھ آئے ہیں۔ گرو ہر گوبند نے سکھوں کے لیے پانچ چیزیں لازمی قرار دیں؛ (کیس) بال، کنگھا، کڑا (ہاتھ میں پہننا کا)، کچھیڑا اور کرپان (تلوار)۔

عبادات و تہوار

سکھ مت میں عبادت کا طریقہ جاپ اور کیرتن (موسیقی کے ساتھ مقدس کتاب پڑھنا) اور شامل ہے۔ سکھوں کی عبادت گاہوں کو "گوردوار" کہا جاتا ہے۔ سکھوں کے اہم تہوار گُرپورب (گروؤں کی سالگرہ) ویساکھی (خالصہ جماعت کی تشکیل کے دن کی یاد میں)، اور بندی چھوڑ (گرو ہر گوبند کی رہائی کی یاد میں) منائے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ گرپرب ایک تہوار نہیں ہے بلکہ یہ سال بھر مختلف ایام میں آتا ہے۔ گرونانک کا گرپرب "نانک پرکاش اُتسو" کہلاتا ہے۔

کنفیوشس ازم

چین کا سب سے بااثر مذہب کنفیوشس ازم جو ایک فلسفی و حکیم "کنفیوشس" سے منسوب ہے۔ اس مذہب کے بارے میں اکثر ماہرینِ ادیان نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہ واقعتاً کوئی مذہب ہے یا صرف ایک اصلاحی تحریک؟ بعض حضرات اسے مذہب شمار کرتے ہیں جبکہ بعض اسے ایک اخلاقی فلسفہ مانتے ہیں۔

کنفیوشس ازم کی تاریخ

جس دور میں مہاویر اور گوتم بدھ ہندوستان میں اخلاقی تعلیمات عام کر رہے تھے اسی دور میں چین میں ایک عظیم مصلح کنفیوشس (551–479BC) کا ظہور ہوا۔ کنفیوشس ایک بہت بڑے فلسفی حکیم اور عالم گزرے ہیں جو چین کے صوبے "لُو" میں پیدا ہوئے۔ اس صوبے کا موجودہ نام شانتونگ (Shandong) ہے۔ ان کا خاندانی نام کنگ فوزے (Kung-Fu-ze) تھا۔ یہ ابھی تین برس کے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی والدہ نے ان کی پرورش کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کنفیوشس نے اس وقت کے

مروجہ علوم مثلاً شاعری، تاریخ، موسیقی، شکار، تیر اندازی وغیرہ میں مہارت حاصل کرلی۔ انیس برس کی عمر میں ان کی شادی کر دی گئی جس سے ان کا ایک بیٹا بھی ہوا لیکن بعد میں انہوں نے علیحدگی اختیار کرلی۔ نوجوانی میں وہ حکومتی اداروں میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک مدرسہ قائم کرلیا تھا جہاں وہ لوگوں کو مختلف موضوعات پر تعلیم دیتے تھے۔ ان کی ملاقات اس وقت کے دوسرے بڑے مذہبی رہنماء اور فلسفی "لاؤزے" سے بھی ہوئی جو تاؤازم کے بانی تھے۔ کنفیوشس کے درس و تدریس کا یہ سلسلہ اس قدر مقبولیت اختیار کر گیا کہ اس وقت کہ حکومتی عہدیدار بھی ان کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس طرح ان کی عمر کا ایک حصہ صوبہ لُو میں ہی گزرا۔ اس کے بعد وہ قاضی مقرر ہوگئے۔ روایات کے مطابق انہوں نے اپنا یہ منصب اس قدر ذمہ داری و دیانتداری سے نبھایا کہ ان کے ماتحت علاقہ انصاف اور امن و امان کے متعلق ایک مثالی معاشرہ بن گیا اور جرائم کی شرح حیرت انگیز حد تک کم ہوگئی۔ اس دوران بھی ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا اور کئی لوگ ان کی شاگردی میں آ گئے۔ لیکن حاسدین کی سازشوں میں آکر بادشاہ نے انہیں ملک بدر کر دیا۔ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہمراہ یوں ہی پھرتے رہے۔ اسی دوران انہیں خدا کا عرفان حاصل ہوا۔ ان کا انتقال 72 سال کی عمر میں ہوا۔ ان کی تدفین "کوفو (Qufu)" میں ہوئی۔

کنفیوشس کی وفات کے کے ان کے نظریات لوگوں میں عام ہونا شروع ہوگئے اور وہ ایک قومی اور بعد ازاں مذہبی ہیرو بن گئے۔ ان کے انتقال کے بعد پورے چین میں اہتمام کے ساتھ سوگ منایا گیا اور حکمران طبقے نے بھی انہیں خروج تحسین پیش کیا۔ چونکہ کنفیوشس نے مذہب کے بارے میں کوئی واضح تعلیم نہیں دی تھی لہٰذا وہ کتابیں جو مذہبی رسوم کی تاریخ پر مبنی تھیں انہیں ہی مذہبی حیثیت حاصل ہوگئی اور چین کا قدیم مشرکانہ مذہب ہی کنفیوشس ازم کی روایت بن گیا۔

کنفیوشس ازم کی تاریخ میں ایک مذہبی عالم مینشیس (Mencius 371-288) خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے کنفیوشس کی تعلیمات کو نئے رجحانات کے مطابق مرتب کیا اور اخلاقی و سیاسی امور پر بہت زیادہ زور دیا۔ جس سے اس مذہب میں رسوم و رواج کا ظاہری رنگ تقریباً ختم ہوگیا۔ مینشیس نے کنفیوشس مذہب کے فروغ کے لیے پورے چین میں کئی دورے کیے جس کی وجہ سے یہ مذہب مزید ترقی کر گیا اور لوگ اس مذہب کے گرویدہ ہوگئے۔ کنفیوشس کی وفات کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد بادشاہ قِن شی ہوانگ (Qin Shi Huang r. 247–221BC) نے چین پر قبضہ کر کے بہت سی ریاستوں پر تسلط جمالیا۔ یہ بادشاہ کنفیوشس ازم کے خلاف تھا اس نے کنفیوشس، مینشیس اور دیگر تمام مذہبی کتب جلوادیں اور کئی علماء کو بھی قتل کروادیا۔ تاہم اس بادشاہ کے انتقال کے بعد ان کتابوں کو از سر نو مرتب کیا گیا اور کنفیوشس ازم اہل چین کا محبوب مذہب بن گیا۔ اس کے بعد دیگر آنے والے سبھی بادشاہوں نے اس مذہب کو قبول کیا اور اس کے فروغ کے لیے کام کیا۔ موجودہ دور میں اس مذہب کے پیروکار چین، جاپان، کوریا اور ویتنام میں کثیر تعداد (اندازاً چھ ملین) میں ہیں۔

کتب مقدسہ [1]

کنفیوشس نے خود مستقل کتابیں بہت کم لکھی ہیں، ان کی ایک کتاب جس میں تاریخِ چین کا خلاصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کنفیوشس نے کئی کتابیں تدوین کیں لیکن وہ کتابیں آج موجود نہیں ہیں۔

1۔لون یو: موجودہ کنفیوشس ازم میں جس کتاب کو اہمیت حاصل ہے وہ لون یُو (Lunyu/Analects) ہے۔ یہ کتاب کنفیوشس اور ان کے شاگردوں کے اقوال اور حالات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب چین میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔اس کتاب میں کنفیوشس اور ان کے شاگردوں کی بیان کردہ وہ تعلیمات ہیں جو سیاست، معاشرت سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب کنفیوشس کی وفات کے ایک صدی بعد ان کے شاگردوں کی اولادوں نے مرتب کیں، تاہم بعد میں ہان سلطنت (206BC-220CE) کے دور میں اسے مکمل کیا گیا۔اس کتاب میں زندگی کے ہر پہلو کے حقائق کو عام فہم کہانیوں اور عمدہ تمثیلی انداز میں بیان کیا گیاہے۔ کنفیوشس کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کافی اہم ہے۔

2۔وُوجِنگ(Wu-Ching/Five Classics)

لُون یون کے علاوہ پانچ کتابیں ہیں جو کنفیوشس ازم میں اہمیت رکھتی ہیں لیکن ان کی حیثیت ان کے پیروکاروں کے ہاں بھی الہامی نہیں ہے۔ یہ سبھی کتابیں چین کی سلطنت "سنگ" کے بادشاہ چوہسی(Chu His 1130-1200CE) کی سرپرستی میں مرتب ہوئیں۔ ان میں چین کے قدیم لوک نغمے، دعائیں اور مناجات، بادشاہوں کے خطبات اور دستاویزات، پیش گوئیاں، تاریخ اور مذہبی عبادات اور رسوم کی تفصیل ہے۔

3۔ سی شُو(Si-Shu/Four Books): اس میں چین کے قدیم مذہبی رسوم ورواج، سیاست، معیشت اور تہذیب کی تفصیل ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کنفیوشس عالم مینشیس کے مکالمات کا مجموعہ بھی شامل ہے۔

عقائد اور اخلاقی تعلیمات

کنفیوشس نے مذہبی تعلیمات کے بارے میں بہت زیادہ وضاحت نہیں کی تھی، ان کا اہم کارنامہ سیاسی اور معاشرتی اصلاح تھا، انہوں نے مابعد الطبیعاتی مسائل پر کوئی بحث کے بجائے صرف اُن اخلاقی تعلیمات پر زور دیا جن کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے تھا۔ تاہم وہ مقدس کتابیں جو ان کی طرف منسوب ہیں اس میں ہمیں مذہبی تصورات مثلاً خدا، حیات بعد الموت بھی ملتے ہیں۔ کنفیوشس کے

[1] http://www.religionfacts.com/a-z-religion-index/confucianism.htm

بارے میں بعض مغربی محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک لامذہب اخلاقی مصلح تھے، لیکن مقدس کتابوں میں ہمیں بعض جگہ ٹی این یعنی ایک حقیقت اعلیٰ کا تصور ضرور ملتا ہے، اگرچہ کنفیوشس سے منسوب ان کتابوں میں خدا کے بارے میں کوئی واضح بیان نہیں ملتا لیکن ان کتابوں میں حیات بعد الموت کا تصور ضرور ملتا ہے جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کنفیوشس خدا کو مانتے تھے موجودہ کنفیوشس ازم میں خدا کا معاملہ ہر ایک انسان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس مذہب میں زیادہ اہمیت سیاسی و معاشرتی اصولوں کی ہے، خدا کا معاملہ ہر ایک انسان کے اپنے سپرد ہے، لہٰذا چین کی اکثر آبادی دیوتا پرستی اور بعض خدا کا انکار بھی کرتی ہے۔

اخلاقی تعلیمات میں یہ تصورات نمایاں ہیں:

1۔ رین (Ren): کنفیوشس کی اخلاقی تعلیمات کی بنیاد "رین" کہلاتی ہے۔ رین کی تشریح کنفیوشس کے الفاظ میں یہ ہے کہ "دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔"[1]

2۔ لی (Li): "لی" کا مطلب رسوم کی ادائیگی، درست معاشرتی رویہ اور اچھے اخلاق ہیں۔

3۔ یی (Yi): اس کا مطلب "احساسِ ذمہ داری" ہے۔ وسیع تر مفہوم میں اس سے مراد سماجی اعتبار سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا اور اپنی فطرت پر چلنا ہے۔

4۔ پانچ عظیم رشتے (Wu-Lun): کنفیوشس کے مطابق زندگی میں پانچ بنیادی عظیم تعلقات ہیں: باپ بیٹے کا تعلق؛ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کا تعلق؛ بیوی اور شوہر کا تعلق؛ بڑوں کا چھوٹوں سے تعلق؛ اور حاکم اور رعایا کا تعلق۔

کنفیوشس نے اس نظام کے تحت یہ تعلیم دی کہ بدنظمی اور فساد اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ ان بنیادی تعلقات میں کہیں خرابی واقع ہو جائے۔ اگر حاکم اپنے رعایا سے اچھا سلوک نہ کرے یا اپنی ذمہ داریاں نہ نبھائے، باپ اور بیٹا اپنے اپنے مقام سے ناآشنا ہوں، یا اسی طرح انسان ان دیگر تعلقات میں کوتاہی کرے۔ اگر ان بنیادی تعلقات کو اگر رین کے اصول کے ساتھ چلایا جائے تو زندگی خوشگوار رہتی ہے۔

فرقے

کنفیوشس ازم میں گروہ بندی اور فرقے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تاہم اس مذہب کی دو جہتیں ضرور موجود ہیں۔ ہم یہ بات پڑھ آئے

[1] CONFUCIAN ANALECTS, translated by James Legge [1893] Chapter 12, http://www.sacred-texts.com

ہیں کہ سونگ سلطنت میں کنفیوشس ازم کی مقدس کتابوں کو از سر نو مرتب کیا گیا اور اس مذہب کے احیاء کا کام ہوا۔ مذہب کے احیاء کا یہ کام ایک عالم زہوزی (Zhy Xi 1130-1200CE) نے کیا تھا۔ کنفیوشس ازم کا یہی احیاء دراصل اسے جدت پسندی کی طرف لے گیا جسے "Neo-Confucianism" کا نام دیا گیا۔ اس جدت پسند مذہب میں قدیم چینی روایات، کنفیوشس کی بیان کردہ تعلیمات کے علاوہ بدھ مت، ایک قدیم مذہب تاؤمت اور وقتِ حاضر کے تقاضوں کا بھی خاص خیال رکھا گیا۔ روایت پسند کنفیوشس ازم میں "ٹیئین (Tian)" کو حقیقت اعلیٰ (یا خدا) مانا گیا ہے اور اس میں جنت و دوزخ کا تصور واضح ہے۔ جبکہ نیو کنفیوشس ازم میں حقیقت اعلیٰ کو "تائی جی" کا نام دیا گیا ہے اور یہ تصور بھی اپنایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح اس میں ضم ہو جائے گی۔ نیز میں تاؤازم اور بدھ مت کے صوفیانہ خیالات کا بھی شامل ہیں۔ نیو کنفیوشس ازم دو مکاتب فکر میں تقسیم ہے البتہ ان کے باہم کوئی گہرا اختلاف نہیں ہے، بلکہ محض فلسفیانہ اختلاف ہے۔ چین میں اب بھی بعض روایت پسند موجود ہیں۔

شنٹوازم

شنٹو ایک چینی لفظ ہے جس کے معنی "دیوتاؤں کا راستہ" ہے۔ یہ جاپان کا قومی مذہب ہے اور اسی ملک اور قوم تک محدود ہے ہندومت کی طرح یہ مذہب بھی کسی ایک مرکزی شخصیت سے منسوب نہیں ہے بلکہ یہ مذہب ہزاروں برس سے جاپان میں ہونے والے تہذیبی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

تاریخ

شنٹوازم کے متعلق عمومی طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس مذہب کی روایت زمانہ قبل از تاریخ سے چلی آرہی ہے۔ قدیم جاپان میں جو قبیلہ حکمران ہوتا تھا وہ سورج کی پرستش کرتا تھا جس کے گرد ہزاروں دیوی دیوتا بھی ہوتے تھے اس کے علاوہ اسلاف پرستی اور مظاہر پرستی بھی اس تہذیب کا اہم عنصر تھا۔ بعض مورخین کے مطابق موجودہ شنٹوازم کی روایت قدیم جاپانی تہذیب میں نہیں تھی، بلکہ یہ مذہبی روایات جنوبی کوریا سے جاپان میں آئی ہیں۔ اسی روایت نے آگے چل کر شنٹوازم مذہب کی صورت اختیار کرلی اور اب یہ مذہب جاپان میں قومی تمدن کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔

اس مذہب کی تاریخ میں کئی جاپانی شہنشاہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ سورج دیوی کی اولاد ہیں اسی وجہ سے جاپان میں شاہ پرستی کا رواج قائم ہوا۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب بدھ مت جاپان میں آیا تو دونوں مذاہب نے آپس میں ایسی مفاہمت کرلی کہ "شنٹوبدھ مت" کے نام سے ایک علیحدہ مذہبی فرقہ بھی بن گیا جو بیک وقت دونوں مذہب کے پیروکار ہوتے تھے۔ نیز تاؤازم اور کنفیوشس ازم نے

بھی اس مذہب پر گہرے اثرات رقم کیے۔اٹھارہویں صدی میں جاپان کے معروف سکالر موٹونوری ناگا (Motoori Norinaga 1730-1807)نے شنٹوازم کو دوسرے مذاہب کے اثرات سے الگ کرکے اس کی خالص صورت میں لانے کی کوشش کی ۔ یہ اس مذہب میں ایک قسم کے مذہبی احیاء کی تحریک تھی جس میں کئی ایسی اصلاحات کی گئی جس کی وجہ سے یہ مذہب دیگر مذاہب سے ممتاز ہوا۔اس کے بعد حکومتی سطح پر اس مذہب کے فروغ کے لیے کئی کوششیں کی گئیں، حتیٰ کہ 1890 میں جاپان حکومت نے اس مذہب کی تاریخ اور بنیادی عقائد کو تعلیمی نصاب میں شامل کرلیا۔موجودہ دور میں بدھ مت کے احیاء کے بعد یہ مذہب زوال کی جانب بڑھا۔اس وقت اس مذہب کے پیروکار اندازاً 2.7 ملین ہیں لیکن ان میں سے اکثر بدھ مت کے پیروکار ہیں جو اس مذہب کو بھی ساتھ ساتھ اختیار کیے ہوئے ہیں۔جاپان میں 86 فیصد لوگ بدھ مت اور شنٹوازم دونوں کے ہی پیروکار ہیں۔[1]

مقدس کتابیں

اس مذہب میں کوئی مقدس کتاب نہیں ہے۔تاہم دو کتابوں کو جاپان میں قومی و ثقافتی اہمیت حاصل ہے۔موجودہ شنٹوازم کے متعلق بیشتر مواد انہی کتابوں میں موجود ہے۔یہ کتابیں کوجوجی (Kojoki) اور دوسری کتاب (Shoku Nihongi) ہے۔اس کے بعد ثانوی حیثیت کی دوسری کتابیں نیہون شوکی (Nihon Shoki)، فُودوکی (Fudoki)، رِکّوکُشی (Rikkokushi)، شوکُونی ہوں گی (Shoku Nihongi)، کوگوشُوئی (Kogo Shūi)، جنّوشوتوکی (Jinnō Shōtōki)اور کوجی کی (Kujiki) ہیں۔ یہ کتابیں تاریخ، گیت، دیوتاؤں کے قصے اور مذہبی رسومات وغیرہ سے متعلق ہیں۔

تصورِ خدا اور حیات بعد الموت

شنٹوازم میں "کامی" کا تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے جو جاپان میں روحانیت کی علامت ہے۔کامی ہی وہ اہم علامت ہے جس کی وجہ سے شنٹوازم اور بدھ مت میں امتیاز واقع ہوتا ہے۔کامی کو بعض اوقات خدا کے مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن اس مذہب کی مطابق سے یہ وہ روح ہے جو مظاہر فطرت میں موجود ہے۔نیز یہ روح جسم کی شکل بھی اختیار کرلیتی ہے۔اس طرح یہ تصور بیک وقت اوتار اور وحدت الوجود کے مترادف ہوجاتا ہے۔نیز شنٹوازم اسی "کامی" تصور کے تحت کئی دیوتاؤں کی پرستش بھی کی جاتی ہے، یہ دیوتا اپنی حرکات و سکنات مثلاً سوچنا، کھانا، پینا وغیرہ میں انسانوں کی ہی طرح سمجھے جاتے ہیں۔دراصل ہندومت کی طرح یہ مذہب بھی مظاہر فطرت سے محبت اور ان کی پرستش کی تعلیم دیتا ہے۔روایات کے مطابق کامیوں کی کئی صورتیں ہیں، جن کی تعداد اسی لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام کامیوں کو Yaoyorozu کہا جاتا ہے۔

---

[1] Chris Rowthorn. Japan. Page 61. Lonely Planet, (Ebook Edition 2010)

ان تمام کامیوں کی نمائندہ علامت "ایماتیراسو(Amaterasu)" ہے جو سورج کی دیوی کہلاتی ہے۔جاپان میں اکثر شہنشاہ یہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ وہ ایماتیراسو کی اولاد میں سے ہیں۔

حیات بعد الموت کے متعلق اس مذہب میں کوئی واضح تصور نہیں ہے، اکثر پیروکار صرف اسی زندگی پر یقین رکھتے ہیں، جبکہ ایک تعداد کا ماننا ہے کہ ہر نیک شخص مرنے کے بعد "کامی" بن جاتا ہے جبکہ بدکار شخص مرنے کے بعد جن بھوت بن جاتا ہے۔

خصوصیات

اس مذہب کی نمایاں خصوصیات (خدوخال) تین ہیں۔

1۔ شاہ پرستی: جاپانی اپنے بادشاہ کو سورج دیوی کی اولاد سمجھتے ہیں اور انہیں دیوتا کی طرح سمجھتے ہیں۔شاہ پرستی اس مذہب میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

2۔ مظاہر پرستی: شنٹوازم کی دوسری اہم بات مظاہر پرستی ہے۔سورج، چاند، ستارے، سمندر، زمین، آگ، جانور پودے سبھی کی پرستش کی جاتی ہے اور ان کی حمد گائی جاتی ہے۔

3۔ آباء پرستی: آباواجداد کی پرستش کرنا بھی شنٹوازم کی ایک اہم روایت ہے۔

عبادت

اس مذہب کے ماننے والے مذہبی رسوم میں انہی روایات کی پیروی کرتے ہیں جو قدیم دور سے جاپان اور چین میں چلی آرہی ہے۔عام طور پر کامی کی عبادت کے خانقاہ یا عبادت گاہ میں پاک صاف ہونے کے بعد جاکر کھڑے ہو کر نقارہ بجایا جاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی عبادت گاہ کے پروہت بھی موسیقی شروع کر دیتے ہیں۔باقی لوگ فرش پر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض موسیقی اور رقص کرتے ہیں۔عبادت کے بعد چاول، ساگ اور روٹی تقسیم کی جاتی ہے۔نیز عبادت کا دوسرا طریقہ خانقاہ میں مخصوص جگہ جاکر پاک صاف ہو کر پھر خانقاہ میں داخل ہو کر اوپر لٹکی ہوئی گھنٹیاں بجانا ہے۔

کاگورا(Kagura) ایک قدیم مذہبی رقص ہے جس کا مقصد کامی سے رابطہ کرنا ہے۔اس رسم میں موسیقی کے ساتھ رقص کرتے ہوئے کامی کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔اس رقص میں کامی دیوی کی حمدوثناء پر مشتمل گیت گائے جاتے ہیں۔اس رقص میں مختلف قسم کے کرتب بھی ہوتے ہیں۔

شنٹوازم میں مقدس موسیقی کو "گاگاکُو(Gagaku)" کہا جاتا ہے۔جاپانی میں اس کا مطلب "خدا کی تفریح" ہے۔یہ رسم دو قسم کی ہوتی

ہے۔ ایک مائی کاگورا کہلاتی ہے جس میں بادشاہ کے دربار میں موسیقی کا اہتمام ہوتا ہے جبکہ دوسری ساٹو کاگورا عام خانقاہوں میں چلتی ہے۔اس موسیقی میں سبھی قسم کے آلات استعمال کیے جاتے ہیں۔

تہوار

شنٹوازم میں مذہبی تہوار بے شمار ہیں جنھیں تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1۔ تائی سائی (عظیم تہوار): موسم بہار کا تہوار ہے اور فصلوں کی کٹائی کے موقع پر منایا جاتا ہے۔اس روز اچھی فصل کے لیے دعائیں کی جاتیں ہیں۔

2۔ چُوسائی (درمیانہ تہوار): جاپان کی آزادی اور نئے سال کے شروع ہونے کی خوشی میں جو تہوار منائے جاتے ہیں انہیں چُوسائی کہا جاتا ہے۔

3۔ زاسائی (چھوٹے تہوار): دیگر تہوار جو علاقائی سطح پر منائے جاتے ہیں زاسائی کہلاتے ہیں۔

تاؤازم

چین کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے مذاہب میں ایک مذہب "تاؤازم" بھی ہے جو ایک بڑے فلسفی "لاؤزے تاؤ(Laozi) " سے منسوب ہے۔ ان کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔لیکن ان کی زندگی کے حالات کے بارے میں تاریخ مکمل طور پر خاموش ہے۔ کنفیوشس مذہب کی روایات بتاتی ہیں کہ ان کی ملاقات کنفیوشس سے بھی ہوئی تھی۔ بدھ مت اور کنفیوشس ازم کی طرح یہ مذہب کی بھی اخلاقی اور فلسفیانہ نظام تھا، تاہم اس مذہب میں ان مذاہب کے برعکس خدائے واحد کا تصور زیادہ واضح ہے۔ لیکن مابعد کے تاؤازم میں دیوتاؤں کا تصور بھی شامل ہوا۔ تاؤازم میں کنفیوشس ازم اور بدھ مت کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔اس مذہب میں "تاؤ" کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔اس کے معنی "راستہ" ہے لیکن اس لفظ کے متعلق اس مذہب میں کئی مفہوم بیان کیے جاتے ہیں مثلاً خدا، آفاقی عقل، بے علت وجود، فطرت، سلامتی کی راہ، گفتگو کرنے کا انداز، اصول و قانون وغیرہ۔ وسیع تر مفہوم میں اس سے مراد وہ روح ہے کو کائنات کی ہر شے میں موجود ہے۔ اسے Ultimate Reality بھی کہا جاتا ہے۔ تاؤ کے مطابق انسان کے لیے سب سے اچھا راستہ یہ ہے کہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر زندگی گزارے۔ یہ لوگ رہبانیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ایک اچھی اور سادہ زندگی بسر کرنا ان کے مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ ابتداء میں تاؤمت کے ماننے والے صرف دیویوں پر یقین رکھتے تھے لیکن بعد ازاں اس مذہب میں لاؤزے اور دیگر مذہبی رہنماؤں کی بھی پرستش کی جانے لگی۔اس کے علاوہ تاؤمت کے لوگ مظاہر فطرت کی بھی

پرستش کرتے ہیں۔اس مذہب کی مقدس علامت "ینگ ینگ" کہلاتی ہے جو دو فطرت میں دو متضاد جنس (نر و مادہ) کی نمائندگی کرتی ہے۔

تاؤزم کی مقدس کتابیں تاؤ تے چنگ (Tao Te ching)، ژینگ زی (Zhuangzi/Chuang-tzu)، لائیزی (Liezi/Lieh Tzu) اور تاؤزنگ (Daozang) ہیں۔ یہ کتابیں چوتھی قبل مسیح سے لے کر چودہویں صدی عیسوی تک کے عرصے پر محیط ہیں اور یہ کتابیں مختلف مصنفین کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ان میں سے ابتدائی دو کتابیں اس مذہب کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں اس مذہب کے پیروکار زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو بدھ مت اور کنفیوشس ازم پر ایمان رکھتے ہیں اور اس مذہب کو بھی ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔اس مذہب کے پیروکاروں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق 2.7 ملین ہے۔

مانویت

مانویت (Manichaeism) ایک قدیم مذہب ہے۔ جس کا ظہور عراق میں ہوا۔ بہت سے مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی اس کے بانی "مانی" سے منسوب ہے جو 217CE میں عراق میں پیدا ہوئے۔ان کے حالات مسلم مورخین کی بدولت آج ہم تک پہنچے ہیں۔ ان مورخین کے مطابق مانی ایک فلسفی تھے جنھوں نے اپنے ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھی جو زرتشتیت، یہودیت اور عیسائیت سے ماخوذ تھا۔اُس دور میں یہ مذہب زرتشتیت فارس کا قومی مذہب تھا، یہ مذہب زرتشتیت کے خلاف ایک چیلنج بنتا جارہا تھا، چنانچہ ایرانی باشاہ بہرام اول (r.273–276CE) جو زرتشتیت کے پیروکار تھا، مانی کو قتل کر دیا اور اس کے پیروکاروں پر ظلم کیا۔ اس ظلم کے بعد مانی مذہب کے پیروکار وسط ایشیاء اور چین کی طرف ہجرت کر گئے۔بعض مورخین کے مطابق ایرانی بادشاہ شاہ پور دوم (r.309-379CE) نے یہ مذہب قبول کر لیا تھا، تاہم اس بارے میں کوئی حتمی شہادت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اس نے مانوی مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ کیا۔اس دوران یہ مذہب چین، مغربی ایشیاء، شمالی افریقہ، جنوبی یورپ، فرانس اور اسپین تک پھیل گیا لیکن ساتویں صدی میں اس مذہب کا اثر ختم ہونے لگا اور بالاخر اس مذہب کو وجود تقریباً ختم ہی ہو گیا۔

مانوی مذہب میں سامی اور غیر سامی دونوں قسم کے مذاہب کے پیغمبروں، اوتاروں اور بدھوں کو تسلیم کیا گیا تاہم یہ بھی واضح کیا کہ اب یہ مذہب تحریفات کا شکار ہو چکے ہیں۔ مانی نے تقریباً سات یا آٹھ کتابیں لکھیں تھی، جسے اس مذہب میں الہامی مانا جاتا تھا، یہ کتابیں سریانی زبان میں لکھی تھیں۔ایک اور کتاب کا نام "ارزنگ" تھا جو تصاویر پر مشتمل تھی۔لیکن اب سوائے چند ایک ٹکڑوں کے ان میں سے کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ مانوی مذہب ثنویت کی طرف مائل ہے نیز اس مذہب میں زرتشتی یزداں کا تصور بھی رائج ہے۔عصر حاضر میں اس مذہب کو معدوم سمجھا جاتا ہے تاہم دنیا میں انتہائی قلیل آبادی اب بھی اس مذہب کی پیروکار ہے۔

اسائن منٹس

1. زرتشت کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں؟ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے بتائیں کہ اس کی کون سی تعلیمات اسلامی تعلیمات سے مشابہت رکھتی ہے؟
2. انٹرنیٹ پر ان مذاہب کی مقدس علامات (Symbols) سرچ کریں۔
3. ایک ٹیبل کے ذریعے واضح کیجیے کہ مذاہب عالم کی بنیادی کتب کو کب اور کتنے عرصے بعد تحریر میں لایا گیا؟

خاتمہ: مذاہب عالم کا تقابل

یہاں پر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کا تقابلی جائزہ ایک جدول کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔

	یہودیت	عیسائیت	ہندومت	بدھ مت	اسلام
اہم مقدس کتاب	عہد نامہ قدیم، تالمود	انجیل	وید	تری پٹک	قرآن
تصور خدا	توحید	تثلیث	تری مورتی	غیر واضح	توحید
تصرف کی حامل مخلوق	فرشتے	فرشتے	دیوی دیوتا	دیوی دیوتا	فرشتے
مذہبی رہبر	انبیاء	انبیاء	اوتار / خدا کا نزول	بدھی	انبیاء
مرکزی شخصیت	ابراہیم و موسیٰ علیہما الصلوۃ السلام	عیسیٰ علیہ الصلوۃ السلام	رام / کرشن / دیگر	گوتم بدھ	محمد صلی اللہ علیہ وسلم
معبود	یہواہ	تین شخصیات پر مشتمل خدا	بھگوان۔ دیوی دیوتا	دیوی دیوتا / بدھ	اللہ
حیات بعد الموت	جنت و دوزخ	جنت و دوزخ	تناسخ / جنت و دوزخ	تناسخ / نروان	جنت و دوزخ
معاشرتی نظام	بنی اسرائیل کی فضیلت	مساوات	ذات پات	راہبوں اور دنیاداروں کا طبقہ	مساوات
اہم تہوار	عید الفصح	کرسمس / ایسٹر	ہولی / دیوالی	ویساکھ / اسھلا پوجا	عید الفطر، عید الاضحیٰ

ببلیوگرافی

ہندومت

1. John Marshal. Mohenjo-Daro and the Indus Civilization. New Delhi: Asian Education Service. (1925)
2. Rama Shankar Tirpathi. History of Ancient India. Delhi: Motilal Banarsidas publisher (1942) First Edition
3. ABBE J A DUBOIS. Hindu Manners. Customs & Ceremonies. Oxford: The Clarendon press.
4. Chandrasekharendra Saraswati. Hindu Dharma: The universal way of life. Mumbai: Bhartiya Vidya bhavan (1995)
5. John Dowson. A Classical dictionary of hindu Mythology and Religion. geography. history. and literature. London: Trubner & co. (sixt edition)
6. Lionel d. Barnett. Hindu Gods and Heroes. New York: e. P. Dutton and company (1992)
7. A Sanskrit-English dictionary Monier-Williams. Monier. Oxford : Clarendon Press. (1882)
8. مہابھارت۔ آر کے نارائن۔ نگارشات پبلشر۔لاہور
9. راجہ راجیشور راؤ اصغر۔ ہندی اُردو لغت۔ سضافہ و مقدمہ سید قدرت نقوی۔انجمن ترقی اُردو پاکستان
10. ڈاکٹر گستاولی (موسیو) لیبان فرانسیسی۔ تمدن ہند۔ اردو۔ مترجم: مولوی سے د علی بلگرامی۔ مطبع شمسی۔ آگرہ: بھارت
11. اے ایل باشم۔ ہندوستانی تہذیب کی داستان۔لاہور: نگارشات پبلشرز

یہودیت

12. Henry Hart Milman. The history of the Jews. London: Murray Publishers. Edition 4th. (1866)
13. Moses Ben Maimon. Jewish Encyclopedia. http://www.jewishencyclopedia.com/articles/11124-moses-ben-maimon (28 Feb 2013)
14. N. R. M. De Lange -An Introduction To Judaism. Cambridge University Press. 2000
15. Sara E. Karesh and Mitchell M. Hurvitz. Encyclopedia of Judaism. p492. USA: Infobase Publishing
16. Gerrit Jan Reinink . Bernard H Stolte and others.The reign of Heraclius. p189. Leuven: Peeters Publisher (2002)

17. یوسف ظفر۔یہودیت۔لاہور: احمد پبلیکیشنز۔2009

بدھ مت

18. Peter Harvey. An Introduction to Buddhism. Cambridge University Press. 1990
19. Geshe Kelsang Gyatso. Introduction to Buddhism. Tharpa Publications UK. 2001
20. Akira Hirakawa. Paul Groner. A history of Indian Buddhism: from Śākyamuni to early Mahāyāna. Reprint published by Motilal Banarsidass Publ.. 1993
21. Manan Sharma. Buddhism (Teachings Of Buddha). Diamond Pocket Books (P) Ltd.. 2002
22. http://www.accesstoinsight.org
23. Arnie Kozak. The Everything Buddhism Book. USA: Everything Books. 2010
24. Raj Pruth. Buddhism And Indian Civilization. New Dehli: Discovery Publishing House. 2004
25. Joseph Edkins. Chinese Buddhism. London: Gorgias Press LLC. 2003
26. V. S. Bhaskar. Faith & philosophy of Buddhism.Dehli: Gyan Publishing House. 2009
27. John Powers. Introduction to Tibetan Buddhism.. Snow Lion Publications. 2007

دیگر مذاہب

28. F.K. Dadachanji. Speeches and Writings on Zoroastrian Religion. Culture & Civilization.
29. Ch'u Chai, Winberg Chai. Confucianism. New York: Barron's Educational Series, 1973
30. ,

31. سکھ مت۔رابرٹ وین ڈی ویئر۔مترجم یاسمین خالد۔لاہور: شاہد پبلشرز

دیگر کتب

32. Kedar Nath Tiwari. Comparative Religion. Delhi: Motilal Banarsidass Publ.. 1983
33. Beth Wright. A Study Companion to Introduction to World Religions Ebook: Fortress Press, 2011
34. Warren Matthews. World Religions.USA: Cengage Learning, 2011
35. http://www.religionfacts.com

36. پروفیسر رشید احمد۔تاریخ مذاہب۔زمرد پبلیکیشنز کوئٹہ (2004)

37. عماد الحسن آزاد فاروقی۔دنیا کے بڑے مذاہب۔مکتبہ جامعہ نئی دہلی (1986)

38. احمد پرویز۔مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں۔طلوع اسلام ٹرسٹ

39. عبد الکریم شہرستانی۔الملل والنحل۔اردو ترجمہ پروفیسر محسن علی صدیقی۔کراچی: قرطاس پبلشر۔(طبع ثانی)

40. اخلاق احمد قادری۔تاریخ عالم۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ (2011)